TEXT CROSS WITHIN THE BOOK ONLY

UNIVERSAL LIBRARY
OU_222504
UNIVERSAL LIBRARY

1275

انقلاب دہلی

داغ

مجروح

سودا

غالب

حالی

ظفر

لال قلعہ دہلی

اُن نظموں کا مجموعہ جو دہلی کی بربادی پر لکھی گئیں

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں یو پی

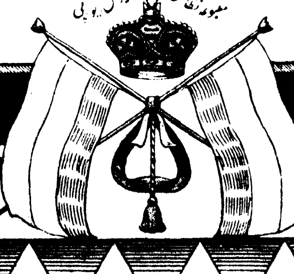

قیمت ۸/

بار اول

فریادِ دہلی

معروف بہ

انقلابِ دہلی

مرتبہ

نظامی بدایونی

سنہ ۱۹۳۱ء

ٹائٹل پیج کے ڈیزائن اور کتاب ہذا کی تالیف کے حقوق
بحق نظامی پریس محفوظ ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ کتاب انقلاب دہلی

(مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کے قلم سے)

تصویر حروف

یعنی

مختصر مقدمہ انقلاب دہلی

اللہ کی حمد و ثنا کے بعد بندہ کو یہ لکھنا ہے کہ جناب مولانا نظام الدین حسین نظامی ساکن بدایوں شریف اخبار ذوالقرنین کے ایڈیٹر اور مشہور و نفیس کتابوں کے شایع کرنے والے نے ایک نہایت ضروری اور مفید کتاب تیار کی ہے جس کو میں تاریخ انقلاب دہلی تصور کرتا ہوں۔

مولانا کو تاریخ سے خاص دلچسپی معلوم ہوتی ہے ان کے اخبار کا نام اسکی شہادت دیتا ہے۔ مگر یہ کتاب تاریخ بھی ہے۔ مرثیہ اور نوحہ بھی ہے۔ نظم و نثر کا ایک عمدہ گلدستہ بھی ہے اور آنے والی نسلوں کے لیئے ان کی تہذیب کی تصویر بھی ہے جو

کچھ مٹ گئی اور باقی مٹ رہی ہے۔

بدایوں اور دہلی کا تعلق ساڑھے چھ سو برس کا پُرانا تعلق ہے۔ کیونکہ بدایوں نے اپنا ایک لال (حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہیؒ) دہلی کو اس وقت دیا تھا جب دہلی میں فاتح ہندوستان سلطان شہاب الدین محمد غوری کے غلام حکومت کر رہے تھے۔ اور دہلی اسلامی شہنشاہیت کا دل اور بدایوں قبۃ الاسلام تھا۔

لیکن یہ کتاب اُس زمانہ کو یاد دلاتی ہے جب غلاموں کے بعد خلجی آ چکے اور خلجیوں کے بعد تغلقوں کا زمانہ بھی ختم ہوا۔ اور سید پھر لودی بھی حکومت کر چکے اور تیمور و بابر نے مغلیہ سلطنت کی بنیاد بھی ڈال لی۔ اور ان کے خاندان کا زوال بھی کمال کو پہونچ گیا۔

یعنی ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ آخری شہنشاہ دہلی کے زمانہ کی باتیں ہیں ۱۸۵۷ء کے مشہور غدر کی حکائتیں ہیں۔

یہ زمانہ مسلمانوں کی حکومت اور مسلمانوں کی تہذیب اور مسلمانوں کی ہر چیز کے ختم ہونے کا زمانہ تھا۔ اور ایسا انقلابی زمانہ تھا کہ اس کے بعد مسلمانوں کی رزم خاموش ہو گئی اور بزم کے چراغ گل ہو گئے۔ اور ان کی ہر اُمنگ تھک کر بیٹھ گئی۔

کتاب انقلاب دہلی میں طرح طرح کے خیالات اور طرح طرح کے جذبات جمع ہیں اور ان میں سے ہر چیز مٹی کا ایک موٹام معلوم ہوتی ہے۔ موٹام مٹی کے اس مینار کو کہتے ہیں جو کسی جگہ سے مٹی کھودنے کے بعد پیمائش کے لیے منارے سے چھوڑ دیئے جاتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ یہاں سے کتنی مٹی کھد گئی۔

اس کتاب کے مضامین بھی ظاہر کرتے ہیں کہ کہاں کہاں کتنی کتنی مٹی تھی اور اب وہ کتنی کھد گئی ہے۔

میں نے غدر دہلی ۱۸۵۷ء کی تاریخ کے ۱۲ حصے لکھے ہیں مگر جو عمدہ موثر لاجواب یا کمیاب چیزیں مولانا نظامی نے اس کتاب میں جمع کی ہیں ان کا میری کتابوں میں نام و نشان بھی نہیں ہے۔

یہ ایک کتاب کا مقدمہ ہے۔ مقدمہ میں مدعی کی ضرورت ہے مگر کتاب "انقلاب دہلی" مدعی بھی خود ہے اور مدعا علیہ بھی آپ ہی ہے۔ اور حاکم و وکیل بھی خود ہی ہے۔ کیونکہ اس میں ایک ایسی قوم اور اس کی حکومت و تہذیب کی بربادی کا ذکر ہے جس کے آج کل سب ہی مدعی و مخالف بن گئے ہیں۔ آسمان کی گردش پہلے صرف شاعروں کی مخالف تھی مگر اب وہ فقط مسلمانوں کی دشمن ہے۔

ذوالقرنین کے ایڈیٹر صاحب کو مسلمانوں کی آئندہ نسل ہمیشہ شکریہ سے یاد کرے گی کہ انھوں نے یہ بہت ہی عمدہ چیز اردو لٹریچر میں تیار کر دی۔ اگر کبھی مسلمان قوم میں کوئی اچھا انقلاب آیا تو اس قسم کی کتابوں کو اقبال کی نظموں اور حضرت اکبر الہ آبادی کے شعروں اور حسن نظامی کی نوحہ نما تحریروں کے پاس ہی جگہ دی جائے گی اور ان کو عمدہ انقلاب کا ذریعہ اور باعث قرار دیا جائیگا۔ میں نے مقدمہ لکھ تو دیا مگر یہ لکھنا مقدمہ کا لکھنا نہیں ہے بلکہ دل کی اور کلیجہ کی دبی ہوئی آہوں کو بزم کاغذ میں نمودار کرنا ہے۔

حسن نظامی

۱۵ فروری ۱۹۳۱ء۔ دہلی

۷۸۶

انقلابِ دہلی کی تمہید

(مرتب کے قلم سے)

بننا بگڑنا دہلی کی قسمت میں لکھا ہے خدا جانے وہ کتنی مرتبہ بگڑی اور کتنی دفعہ بنی تاریخ کی کتابیں تو ان انقلابات سے بھری پڑی ہیں لیکن اُردو ادب کے صفحات میں بھی ان واقعات کی جھلک نمایاں ہے۔ نادر شاہی حملے سے دہلی کی بربادی پر سودا[1] نے جو مرثیہ لکھا تھا آج بھی وہ اُردو شاعری کی دُنیا میں مشہور ہے۔ دہلی کے جلیل القدر بادشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے بیٹوں اعظم و معظم کی خانہ جنگی کا نوحہ[2] جو آج سے سوا دو سو سال قبل جبکہ اُردو شاعری ملکہ اردو زبان کی شیرخوارگی کا عالم تھا لکھا گیا تھا اور جعفر زٹلی جیسے مشہور شاعر کے دل پر چوٹ لگنے کا نتیجہ ہے آج تک یادگار ہے۔ سب سے آخری ضرب

---

[1] سودا کی یہ تین نظمیں اس کتاب کے آخر میں صفحہ ۱۰۹ پر درج ہیں۔

[2] جعفر زٹلی کے اس نوحہ کے اشعار جو قدیم اُردو کا نمونہ ہیں حسب ذیل ہیں

کہاں اب پائیے ایسے شہنشاہ ٭ مکمل کامل و اکمل دل آگاہ
رکت کے آنسو دل جگ روتا ہے ٭ نہ میٹھی نیند کوئی سوتا ہے
صدائے توپ و بندوق است ہر سو ٭ ہمہ اسباب و صندوق است ہر سو
دوا دو ہر طرف بھاگڑ پڑی ہے ٭ بچہ در گود سر گٹھیا دھری ہے
کھٹا کھٹ و لٹ لوٹ است ہر سو ٭ جھٹا جھٹ پھٹا پھٹ است ہر سو
بہر سو مار مار و دھاڑ دھاڑ است ٭ ادھل چال و تیر و خنجر کٹار است

جو دہلی کی امن پر پڑی وہ ۱۸۵۷ء کی زد تھی۔ دہلی کی یہ بربادی ایسی نہ تھی کہ اُس وقت کے شعرا خاموش بیٹھتے۔ غدر کی مصیبت جن لوگوں کی آنکھوں کے سامنے گزری تھی اُنھوں نے ان واقعات کے بیان کرنے میں خوب خوب زور قلم دکھایا ہے۔ مرزا غالب نے تو اپنے روزمرہ کے خطوط میں بھی جابجا یہی دکھڑا رویا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا" ایک خط میں فرماتے ہیں "یہاں اغنیا اور امرا کی ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیئے" ایک دوسرے خط میں تحریر ہے "جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی دارالبقا فنا ہو جائے گا۔ رہے نام اللہ کا"

غالب نے نظم کے ذریعہ سے بھی ان جذبات کا کچھ کم اظہار نہیں کیا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے   گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

ذیل کے قطعہ بند اشعار میں بھی مرزا نے لٹی کھسٹی دہلی کی ہو بہو تصویر کھینچدی ہے ؎

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس   یوں کہا آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب

بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے   یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

غالب کے سوا اس عہد کے دوسرے شعرا سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ آزردہ۔ داغ حالی۔ سالک۔ افسردہ۔ شیفتہ۔ صابر۔ ظہیر۔ عیش۔ مجروح جیسے مشاہیر شعرا کے علاوہ ایسے لوگوں نے بھی بدنصیب اور اُجڑی پجڑی دہلی کے مرثیے لکھے فن شعر میں جن کو شغف نہ تھا اور جن سے اس مرثیے کے سوا دوسرا کلام یادگار نہیں۔ اور تو اور تشنہ جیسے آزاد منش شاعر بھی جنھیں سچ مچ اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ تھا اس طرح پکار اُٹھے ؎

تمام شہر تلنگوں نے آکے لوٹ لیا　　مثل ہے بھوکوں کو ننگوں نے آکے لوٹ لیا

شیفتہ نے شہر آشوب لکھنے کے علاوہ اپنے دیوان میں بھی دلی کی بربادی کا مختلف اشعار میں ذکر کیا ہے مثلاً ؎

ہر چند کہ ہے شیفتہ دلّی وطن اپنا　　ویرانے کی مانند کہیں دل نہیں لگتا

۱۸۵۷ء کے عبرتناک واقعہ کو تقریباً پون صدی کا عرصہ گزر چکا ہے اس لیے آج تہتر سال کے بعد اُن تمام نظموں کو جو اس واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی گئیں جمع کرنا مشکل تھا لیکن پھر بھی چھیالیس شاعروں کی چونسٹھ نظمیں کمال جستجو سے دستیاب ہوئیں جن کو ہم نے ان اوراق میں جمع کر دیا ہے۔ یہ نظمیں شعرا کے تخلص کے لحاظ سے بہ ترتیب حروف تہجی درج کی گئی ہیں جن شعرا کا سن ولادت و وفات اور کچھ حال معلوم ہو سکا ہے وہ بھی لکھ دیا ہے ان چھیالیس شاعروں میں دو ہندو شعرا کے نام بھی ملتے ہیں جنھوں نے دہلی کے اُجڑنے کا ماتم مسلمانوں سے کم نہیں کیا ہے۔ منشی رام پرشاد ظاہر دہلی میں اسلامی سلطنت کا مرثیہ پڑھتے ہوئے بادشاہان اسلام کو اس طرح روئے ہیں ؎

کس کے سر پر نہیں احسانِ شہانِ دہلی　　بارِ منت سے بھلا کس کا نہیں سر نیچا

منشی رام پرشاد ظاہر نے دہلی کے شاہان اسلام کی نسبت اپنا یہ خیال جس وقت ظاہر کیا تھا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ان بادشاہوں کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اس حکومت کا وہ چراغ بھی جو برائے نام قلعہ کے اندر ٹمٹما رہا تھا گل ہو چکا تھا اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شاعر نے جو کچھ کہا اُس میں خوشامد یا چاپلوسی کا شائبہ ہے بلکہ فی الحقیقت اُس نے ایک واقعہ کو نظم کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کو موجودہ زمانہ کے بعض غیر مسلم مصنفین جس رنگ میں پیش کرتے ہیں اور جو رنگ ہمارے سے

؎ ۱۲۶۲ھ میں خان دہلی ایک کتاب شایع ہوئی تھی جو اب نایاب ہے اس سے بہت مدد ملی۔

نوجوانوں کے قلوب کی صاف وشفاف تختیوں پر نفاق اور شقاق کے نقوش مرتسم کرتا ہے وہ حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ ایک اور واقعہ سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ پچھلے مسلمان بادشاہوں پر جبر و تعدی وغیرہ رواداری کا جو الزام لگایا جاتا ہے وہ نہ صرف غلط ہے بلکہ حالت اُس کے برعکس تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں فوجوں میں جب بغاوت شروع ہوئی تو ہر مذہب وملت کے سپاہی اپنی اپنی چھاؤنی میں آگ لگا کر دہلی کے معزول بادشاہ ابوظفر بہادر شاہ کی طرف دوڑ پڑے ہندو سپاہی بجائے اس کے کہ کسی ہندو راجہ کی طرف متوجہ ہوتے غریب بے بس بہادر شاہ کی جے پکارنے لگے۔

ان نظموں پر نظر ڈالنے سے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ دہلی پر خون کے آنسو صرف دہلی والوں ہی نے نہیں بہائے ہیں بلکہ دوسرے مقامات کے لوگ بھی اس کی بربادی سے متاثر تھے جیسا کہ بجنور، پانی پت اور لکھنؤ کے شعرا کی نوحہ پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ لطف لکھنوی نے دہلی کے عالمگیر ماتم کا اظہار اپنے لفظوں میں اس طرح کیا ہے ؎

اُٹھ گیا لطفِ محبت نہ رہا دل کو قرار   کون ہے جس کو نہ پہونچا ہو نشانِ دہلی

دہلی والوں کے رنج وملال کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں ایک دہلوی شاعر نے شدتِ غم سے تنگ آ کر طنزاً یہ کہہ دیا کہ دہلی مٹ گئی اچھا ہوا اور صرف اسی مضمون کو ایک مطلع میں کھپا کر چپ سادھ لی۔ فرماتے ہیں ؎

مٹ گیا خوب ہوا نام ونشانِ دہلی
کس کی پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی (راقم)

دلی کے شعرا نے جہاں عزت آبرو مال دولت سلطنت حکومت محل دو محلوں کی لوٹ کا رونا رویا ہے اُسی کے ساتھ اپنی زبان کی بربادی کی کچھ کم مرثیہ خوانی نہیں کی ہے

شاید ہی کوئی نوحہ ایسا نکلے گا جس میں دلّی کی پیاری زبان کے بگڑنے کا افسوس نہ کیا گیا ہو۔ ایک شاعر نے فرمایا ہے ؎

میری فریاد سے ظاہر ہے بیان دہلی
دل خوں گشتہ پہ ہے داغِ زبانِ دہلی

شاطر دہلوی کا شعر ہے ؎

غدر کو تیغ نہ سمجھوں تو بھلا کیا سمجھوں
دل پہ آتا ہے نظر زخمِ زبانِ دہلی

ظہیر دہلوی نے کس درد سے کہا ہے ؎

رہ گئے کہنے کو کچھ کچھ ہیں فسانے باقی　　اب نہ دہلی ہی رہی اور نہ زبانِ دہلی

زبان کے ساتھ اہل علم و اہل فن کا ماتم بھی کچھ کم نہیں کیا ہے ایک مرثیہ کا شعر ہے ؎

غزل کا ذکر نہ چرچا کسی یگانے سے
مذاقِ شعرِ وسخن اُٹھ گیا زمانے سے

مولانا حالی نے بالکل سچ فرمایا ہے ؎

جتنے رہنے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق　　آکے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز
کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدرشناس　　قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

"دنیا بامید قائم است"، فارسی کا ایک پرانا مقولہ ہے فی الواقع اُمید ہی وہ چیز ہے جو ٹوٹے ہوئے دلوں کو ڈھارس بندھاتی ہے اُس کے خیال سے مردنی زندگی سے بدل جاتی ہے دلی کے ستم رسیدہ شعرا کو بھی مایوسی میں اُمید کی جھلک نظر آتی تھی اور ان کے دل سے یہ آوازیں نکلتی تھیں ؎

الٰہی پھر اسے آباد و شاد دکھلا دے
الٰہی پھر اسے حسب مراد دکھلا دے

ایک فارسی نوحہ میں اس طرح دعا مانگی گئی ہے

بازش از لطف و کرم آباد کن
ساکنانش را خدایا شاد کن

حکیم آغا جان عیش کا دعائیہ شعر ہے

الٰہی کر دے پھر آباد باغِ دہلی کو
کر اپنے فضل سے روشن چراغِ دہلی کو

سنہ ۱۹۱۱ء میں جبکہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا ان دعاؤں کی قبولیت کا وقت آیا اور انگریزی حکومت نے ہندوستان کے قدیم دارالسلطنت کو چھوڑ کر کلکتہ میں جو نیا گھر بسایا تھا جارج پنجم ملک معظم کی زبان کی ایک گردش نے اس کو اُجاڑ کر دلّی کو پھر بھاگ لگا دیئے. نئی حکومت نے نئی دہلی بسائی اور فلک نما عمارتیں لاکھوں روپیہ صرف کر کے تیار کر دیں جن کی افتتاحی رسم اسی ماہ فروری میں ادا ہوئی ہے ان عمارتوں میں نائب السلطنت گورنر جنرل ہند کے رہنے کا مکان بھی ہے. ہندوستان کی مرکزی مجلس وضع قوانین کا ایوان بھی ہے۔ نئی دہلی ہی میں ہندوستان کا نیا نظام حکومت جس کی بنیاد جمہوریت کے اصول پر رکھی جانے والی ہے رونما ہوگا اور نئی دہلی کی تعمیر ہندوستان کے لیے مبارک ثابت ہوگی اور نظام حکومت کا یہ نیا انقلاب اُن مصیبتوں کو جو پچھلے انقلابوں میں نازل ہو چکی ہیں بھلا دے گا

یہ ہی انقلاب دہلی کی مختصر داستان اور بس۔

خاکسار

نظامی عفی عنہ

نظامی پریس بدایوں

۲۱ر فروری ۱۹۳۱ء

فہرست نظم ہائے مشمولہ انقلاب دہلی

نمبر شمار	صفحہ	تخلص شاعر	ابتدائی مصرع نظم
۱	۱	آزردہ مرحوم دہلوی	آفت اس شہر میں قلعہ کی بدولت آئی
۲	۳	احسن مرحوم دہلوی	ہائے وہ لوگ جو تھے روح روان دہلی
۳	۴	" " "	شہر خالی شدہ از پیر و جوان دہلی
۴	۴	اختر مرحوم بجنوری	ہائے افسوس کہ آفت زدگان دہلی
۵	۶	احمد مرحوم دہلوی	حیف برباد ہوئی شوکت و شان دہلی
۶	۶	افسردہ مرحوم دہلوی	ہر طرف سے ہے برستی بیکسی
۷	۱۰	اکرام مرحوم دہلوی	پوچھ مت حال زبان دہلی
۸	۱۱	تجمل مرحوم دہلوی	صرف اک نام کو باقی ہے نشان دہلی
۹	۱۲	"	مل گئے خاک میں سب غنچہ لبان دہلی
۱۰	۱۳	"	پھر بندھا دل پہ خیال دہلی
۱۱	۱۳	"	پھرتے چلتے جو میں آ نکلا بہ شہر دہلی
۱۲	۱۵	تشنہ مرحوم دہلوی	عجب کوچہ رشک جناں تھا دہلی کا
۱۳	۱۸	ثاقب مرحوم دہلوی	اے کہن سال فلک دشمن جان دہلی
۱۴	۱۹	حسامی مرحوم دہلوی	گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
۱۵	۲۰	حالی مرحوم پانی پتی	جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز

(ب)

نمبرشمار	صفحہ	تخلص شاعر	ابتدائی مصرع نظم
۱۶	۲۳	داغ مرحوم دہلوی	فلک میں و ملائک جناب بھی دہلی
۱۷	۲۶	″ ″ ″	یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمان دہلی
۱۸	۲۸	راقم مرحوم دہلوی	مٹ گیا خوب ہوا نام و نشان دہلی
۱۹	۲۹	رضوان مرحوم دہلوی	میری فریاد سے ظاہر ہے بیان دہلی
۲۰	۳۰	سالک مرحوم دہلوی	جہان میں شہر ہیں جتنے جہاں جہاں آباد
۲۱	۳۴	″ ″ ″	روئے جنت میں بھی ہم کرکے بیان دہلی
۲۲	۳۴	″ ″ ″	شہر دہلی ہوا ہے کیوں خالی
۲۳	۳۵	سپہر مرحوم دہلوی	مٹ گیا صفحۂ عالم سے نشانِ دہلی
۲۴	۳۶	سوزاں مرحوم دہلوی	ہر ایک شہر میں شور و بکا ہے دہلی کا
۲۵	۴۶	″ ″ ″	یہ ابتدائی بلا تھی جو پوربی لائے
۲۶	۴۶	شاطر مرحوم دہلوی	کوئی عالم میں نہیں شہر بسانِ دہلی
۲۷	۴۷	شایق مرحوم دہلوی	بود اندر دہر فلک دشمن جانِ دہلی
۲۸	۴۸	شمشیر مرحوم دہلوی	کیسے کیسے ہوئے برباد مکان دہلی
۲۹	۴۹	شیفتہ مرحوم دہلوی	ہائے دہلی و زہے دل شدگانِ دہلی
۳۰	۴۹	صابر مرحوم دہلوی	بسکہ بیداد سے ٹوٹے ہیں مکانِ دہلی
۳۱	۵۰	صغیر مرحوم دہلوی	کیا آسمان آج بد عنوان ہو گیا
۳۲	۵۲	ضمیر مرحوم دہلوی	کس کے آگے میں کروں آہ بیانِ دہلی
۳۳	۵۳	طالب مرحوم دہلوی	دلی والوں کی زباں پر ہے بیانِ دہلی

نمبر شمار	صفحہ	تخلص شاعر	ابتدائی مصرع نظم
۳۴	۵۳	ظاہر دہلوی	کیوں نہ آوارہ پھریں غمزدگانِ دہلی
۳۵	۵۴	ظفر مرحوم بادشاہ دہلی	کیا پوچھتے ہو کجروی چرخ چنبری
۳۶	۵۶	ظہیر مرحوم دہلوی	فرشتہ مسکن و جنت نشان تھی دہلی
۳۷	۶۳	" " "	بل بے دہلی و زہے شوکت و شان دہلی
۳۸	۶۴	عابد مرحوم دہلوی	ہم نے مانا کہ ملی خاک میں شانِ دہلی
۳۹	۶۵	عاصی مرحوم دہلوی	جنتی لوگوں سے سُن سُن کے بیانِ دہلی
۴۰	۶۵	عاقل مرحوم دہلوی	کیا کروں کس سے کروں آہ بیانِ دہلی
۴۱	۶۵	عباس مرحوم دہلوی	نقشۂ خلد تھا گویا یہ مکانِ دہلی
۴۲	۶۶	عزیز مرحوم دہلوی	کیجے اے ہمنفسو خاک بیانِ دہلی
۴۳	۶۷	عزیز مرحوم دہلوی (مرزا)	جنتی دیکھ کے کہتے ہیں خزانِ دہلی
۴۴	۶۸	عیش مرحوم دہلوی	عجب طرح کی باغ و بہار تھی دہلی
۴۵	۷۶	" "	مل گئی خاک میں شانِ دہلی
۴۶	۷۸	" "	کیا جانے اہل دہلی سے کیا بات ہوگئی
۴۷	۷۸	" "	حالِ عالم آہ کیف و کم میں کیا تھا کیا ہوا
۴۸	۷۹	غالب مرحوم دہلوی	بسکہ فعالِ ما یرید ہے آج
۴۹	۸۰	" "	ایک اہل درد نے سنسان جو دیکھا قفس
۵۰	۸۰	فرحت آنجہانی دہلوی	کوئی مفلسی میں ہے مبتلا کوئی تنگ حالی سے خوار ہے
۵۱	۸۱	قمر مرحوم دہلوی	کیا کروں دوستو میں تم سے بیانِ دہلی

نمبر شمار	صفحہ	تخلص شاعر	ابتدائی مصرع نظم
۵۲	۸۲	کامل مرحوم دہلوی	تمام گلشن عیش و سرور تھی دہلی
۵۳	۸۳	" " "	مٹ گیا پر نہ مٹا نام و نشانِ دہلی
۵۴	۸۵	کوکب مرحوم دہلوی	مٹ گئے ہائے مکیں اور مکانِ دہلی
۵۵	۸۶	لطف مرحوم لکھنوی وارد دہلی	حیف ہے اُٹھ گئے گیا پیر و جوانِ دہلی
۵۶	۸۷	مبین مرحوم دہلوی	پسند خاطرِ ہر خاص و عام تھی دہلی
۵۷	۹۳	" " "	دل غنی رکھا سخاوت پہ نہ زر والوں نے
۵۸	۹۵	" " "	یہ نئی ہے گردشِ چرخِ کہن
۵۹	۹۶	" " "	ہوئے دفن جو کہ ہیں بے کفن انھیں روتا ابر بہار ہے
۶۰	۹۸	مجروح مرحوم دہلوی	یہ کہاں جلوۂ جاں بخش بتانِ دہلی
۶۱	۹۹	محسن مرحوم دہلوی	دیارِ ہند میں یہ تخت گاہ تھی دہلی
۶۲	۱۰۵	" " "	وہ پری چہرہ ہوئے قتل میانِ دہلی
۶۳	۱۰۶	مہدی مرحوم دہلوی	رات دن لب پہ نہ ہو کیونکہ بیانِ دہلی
۶۴	۱۰۸	ہنر مرحوم دہلوی	تھے ہنر ہم سبب عظمت و شانِ دہلی
۶۵	۱۰۹	سودا مرحوم دہلوی	کہا میں آج یہ سودا سے کیوں ہے ڈانوا ڈول
۶۶	۱۱۴	" " "	اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
۶۷	۱۲۰	" " "	باغ دہلی میں جو اک روز ہوا میرا گزر

۶۸۶

آزردہ مولوی مفتی صدرالدین خاں مرحوم دہلوی

۱۸۵۷ء سے پہلے صدر الصدور تھے۔ میر ممنون دہلوی سے تلمذ تھا۔ ۱۲۰۴ھ م ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء م ۱۲۸۵ھ میں انتقال ہوا۔

آفت اس شہر میں قلعہ کی بدولت آئی
روزِ موعود سے پہلے ہی قیامت آئی

واں کے اعمال سے دلی کی بھی شامت آئی
کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی

گوشزد تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جو سنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

جن کو دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا
اُن کی خلوت سے کوئی واقفِ اسرار نہ تھا

اہل نااہل سے خلطا انھیں زنہار نہ تھا
آدمی کیا ہی فرشتہ کا بھی واں بار نہ تھا

وہ گلی کوچوں میں پھرتے ہیں پریشاں در در
خاک بھی ملتی نہیں اُن کو کہ ڈالیں سر پر

زیور الماس کا سب جن سے نہ پہنا جاتا
گلچ کا جن سے دوپٹہ نہ سنبھالا جاتا

بھاری جھومر بھی کبھی سر پہ نہ رکھا جاتا
لاکھ حکمت سے اُڑھاتے تو نہ اوڑھا جاتا

سر پہ وہ بوجھ لئے چار طرف پھرتے ہیں
دو قدم چلتے ہیں مشکل سے تو پھر گرتے ہیں

طبع جو گہنے سے پھولوں کے اذیت پاتی
صبح سے شام تلک نیند نہ اُن کو آتی
مہندی ہاتھوں میں لگا سوتے تو کیا گھبراتی
ایک سلوٹ بھی بچھونے میں اگر پڑ جاتی
اُن کو تکیہ کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا
سنگ پہلو سے اُٹھایا تو سرہانے رکھا

جن کو بن دوشِ پرستار نہ چلتے دیکھا
کبھو بیدار نہ سورج کے نکلتے دیکھا
صبح سے شام تلک عطر ہی ملتے دیکھا
پاؤں دالبے پہ بھی کروٹ نہ بدلتے دیکھا
وہ ہیں اور دشت ہیں اور کوہ ہیں اور نالے ہیں
قدم اُٹھتا نہیں پاؤں میں پڑے چھالے ہیں

عیش و عشرت کے سوا جن کو نہ تھا کچھ بھی یاد
ٹکڑے ہوتا ہے جگر سُن کے یہ اُن کی فریاد
لُٹ گئے کچھ نہ رہا ہو گئے بالکل برباد
پھر بھی دیکھیں گے الٰہی کبھو دہلی آباد
کب تلک داغِ دل ایک ایک کو دکھلائیں ہم
کاش ہو جائے زمیں شق تو سما جائیں ہم

دیکھ سکتے نہ تھے جس بات پہ وہ اڑتے تھے
پاؤں رکھتے تھے کہیں اور کہیں پڑتے تھے
صلح سے زیادہ مزا تھا جو کبھو لڑتے تھے
انچلوں سے نرے مقیش پڑے جھڑتے تھے
اُن کو رونے کے سوا شغل نہ کچھ رہتا ہے
ایک دریا ہے کہ آنکھوں سے پڑا بہتا ہے

عطر صندل میں جو دامن کو بسایا کرتے
بیٹھ خلوت میں جو زلفوں کو بنایا کرتے
گندھے موتی کے گریباں میں لگایا کرتے
یہ سنگھار آئینے کو بھی نہ دکھایا کرتے
اب نہیں کچھ بھی انھیں زلفِ پریشاں کی خبر

نہ گریباں کی خبر اور نہ داماں کی خبر

روز بن ٹھن کے نکلنا وہ جوانوں کا کہاں — بیٹھنا ناز و ادا سے وہ دوگانوں کا کہاں
شور ہر کوچے سے ٹپوں کی وہ تانوں کا کہاں — لطفِ ساقی کا مزا اور وہ گانوں کا کہاں

وہ مغنی نہ رہا اور وہ ساقی نہ رہا
دھوتی بندوں کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہا

شکل ایسی کہ خدا اُس کو نہ پھر دکھلاوے — اُن کی پوشاک کو گر دیکھیں تو پھریری آوے
نظر آجائیں اگر وہ سرِ راہے گاہے — خون اپنا کریں یا اُن کا یہی جی چاہے

جن کے ہاتھوں سے نہ لیں بیر بھی دو کوڑی کے
چاندنی چوک میں پھرتے ہیں وہ اینڈے گیلے

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے — سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے — مصطفےٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

احسن۔ حکیم محمد احسن خاں مرحوم دہلوی

حکیم محمد محسن خاں مرحوم دہلوی کے صاحبزادے۔ مرزا قربان علی بیگ سالک کے شاگردِ خاص تھے عنفوانِ شباب تھا کہ [illegible]ھ م [illegible]ء میں انتقال ہوا۔

ہائے وہ لوگ جو تھے روحِ روانِ دہلی — آ درِ خلد گئے کر کے گمانِ دہلی
خرموئی صفا کی جو تجلّی پیدا — بقعۂ نور ہے ہر ایک مکانِ دہلی

چاندنی چوک کو سینہ کہیں اور قلعہ کو سر
مسجدِ جامع کو ٹھہرائیں میانِ دہلی

لامِ دہلی علم اور ہائے کا شوشہ پرِ چشم
اب تو باقی ہی فقط نام و نشانِ دہلی

کیا کوئی فتنہ ہی ای چرخِ ستمگر باقی
چشمِ خورشید سے کیوں ہی نگرانِ دہلی

غمِ بربادیِ دہلی میں بجائے مئے ناب
خونِ دل پیتے ہیں اب بادہ کشانِ دہلی

یہ محبت ہی مجھے یہاں سے کہ بعد از مردن
روزنِ قبر سے بھی ہوں نگرانِ دہلی

کیا عجب ہی کہ یہی خلد میں بولی جاوے
اہلِ جنت کی پسند آئے زبانِ دہلی

سینہ احسن کا جو چیرا تو بقولِ رضواں
دلِ خوں گشتہ پہ ہی داغِ زبانِ دہلی

ایضاً

شہر خالی شدہ از پیر و جوانِ دہلی
رفت برباد متاعِ دل و جانِ دہلی

ایں طلسمے بود و غدر کشائندہ آں
کس ندانست چو من سرِّ نہانِ دہلی

دلِ حسرت زدۂ من شدہ گنجِ قاروں
درہم داغِ الم داد زبانِ دہلی

عینکِ مہر بچشمِ فلکِ پیر چرا ست
بخیالست نمودار نشانِ دہلی

احسنِ خستہ جگر رفت بسوئے جنت
حوریاں را مگر آموخت زبانِ دہلی

احقر۔ مولوی ممتاز حسین مرحوم بجنوری

جائے افسوس کہ آفت زدگانِ دہلی
جان لیتے ہیں جو کرتے ہیں بیانِ دہلی

خلد کے نام کو اب چاہیئے دہلی لکھیں
جا بسے جبکہ وہاں سارے سرانِ دہلی

کیا فصاحت کا کہوں حال کسی سے نہ سنی — عرش سے فرش تلک مثل زبانِ دہلی
دین شایع تھا یہاں تک کہ صنم خانوں میں — درس توحید سناتے تھے بتانِ دہلی
ای فلک یہ بھی ہی انصاف کوئی نا انصاف — شہر ویرانہ ہو اب نام و نشانِ دہلی
قدسیوں کو نہیں آرام کہ تا روزِ جزا — عرش پر جائے گی ہر لحظہ فغانِ دہلی
فیضِ خواجہ سے وہی نزد خدا عزت ہی — گرچہ ظاہر میں گئی عزت و شانِ دہلی
آلِ فرعون کے جوں ظلم سے آلِ موسیٰ — ایسے بیکس ہوئے افسوس کسانِ دہلی
نہ رہا کوئی کیا ایسا فلک نے برباد — خضر و الیاس ہیں اب فاتحہ خوانِ دہلی
جس کو رضواں نے کئی بار خدا سے چاہا — تھا وہ دُنیا میں بلاریب مکانِ دہلی
یا خدا تو ہی ملک بھیج کہ آباد کریں — کوئی باقی نہیں اب مرتبہ دانِ دہلی
شکر ایزد کہ رہی مسجدِ جامع قایم — اب توقع ہی کہ یہ بچ گئی جانِ دہلی
کونسا غنچۂ دل تھا کہ نہ پژمردہ ہوا — ہند میں ایسی چلی بادِ خزانِ دہلی
یہ خداداد تھی وہاں عقل کہ ہنگامِ جزا — شیر پر ہوتے تھے اسوار شہانِ دہلی
اب بھی ایسے ہیں کہ زک پائے فلاطوں ان سے — کوئی آڑ جائے اگر ہیچمدانِ دہلی
ہیچ تدبیر ہی تقدیر کے آگے ورنہ — کیسے کیسے تھے ذکی پیر و جوانِ دہلی
چل بسے ملکِ عدم کو کوئی باقی نہ رہا — وائے بر جورِ فلک فیض رسانِ دہلی
آج اس باغ میں ہر جا پہ ہیں اشجارِ زقوم — ظل افگن تھے جہاں سروِ چمانِ دہلی

جانِ احقر کی طرح بے سر و سامان رہی
لے گیا کون خدا تاب و توانِ دہلی

احمدؔ۔ میر شاہجہاں صاحب دہلوی

حیف برباد ہوئی شوکت و شانِ دہلی
ہاں مگر نام کو باقی ہے نشانِ دہلی

کیا ستم تجھ پہ پڑی سچ تو بتا پیرِ فلک
تو نے چن چن کے بلائے جو جوانِ دہلی

کیوں نہ پوچھیں کہ یہ آذر نے بنائے تو نہیں
دستِ قدرت نے تراشے ہیں بتانِ دہلی

کیوں چھپا پردۂ ظلمات میں آبِ حیواں
اُس نے دیکھا تھا مگر آبِ روانِ دہلی

ذکر وہ آکے سُنے خلد کا تم سے واعظ
جس نے دلی میں نہ دیکھے ہوں مکانِ دہلی

حشر میں حضرتِ باری کو بھی ہوگا افسوس
جبکہ پہنچینگے وہاں مرثیہ خوانِ دہلی

اہلِ پورب کو غزل تم نہ سُنانا احمدؔ
سیکھ جائیں نہ کہیں طرزِ زبانِ دہلی

افسرؔدہ۔ قاضی فضل حسین خاں مرحوم دہلوی

قاضی علی جان مرحوم رئیس دہلی کے صاحبزادے تھے۔ اس شہر آشوب کے سوا ان کے کلام کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ سنہ وفات معلوم نہوا۔ یہ سمجھنا چاہیئے کہ ۱۸۵۸ء یا اس کے قریب جب یہ نظم لکھی گئی زندہ تھے۔

ہر طرف سے ہے برستی بیکسی
رات دن کا ہو گیا رونا ہنسی

ہے ہجومِ درد و غم اور بے بسی
موت کو سمجھا ہوں اب مطلب رسی

اے کہ از وضع تو چرخ انگارہ
دردِ بے درمانِ ما را چارہ

ایک تو اندیشۂ روزِ جزا
اک غمِ بربادیِ عالم سرا

اور پھر رنج اپنے مال و جان کا — یارب اس طوفان سے تو ہی بچا

ہم توئی اینجا و آنجا دادرس
من ندارم در دو عالم جز تو کس

ہائے کیا دہلی پہ آفت آگئی — چین سے بیٹھے تھے شامت آگئی
سر پہ عالم کے مصیبت آگئی — فوج کیا آئی قیامت آگئی

وقتِ تنگ آمد ترحم یا رحیم
لطف کن بر دردمندانِ سقیم

تھی یہ دہلی رشکِ گلزارِ ارم — خاک سے تھا جس کی بنا جامِ جم
ہوگئی برباد و ویراں ہے ستم — ہے یہ وہ غم جس پہ خود رو دیوے غم

بازش از لطف و کرم آباد کن
ساکنانش را خدایا شاد کن

آشنائے قلزمِ عیش و طرب — ہوگئے سب غرقِ دریائے تعب
جوششِ گریہ ہے جوشِ خندہ لب — چشم تر ہے جوں حبابِ بحر آب

از کجا ایں سیلِ آفت در رسید
کاینچنیں چشمِ فلک طوفاں ندید

بانٹتے تھے رات دن جو سیم و زر — پھینکتے تھے کوڑیوں کی جا گہر
مانگتے پھرتے ہیں اب وہ دربدر — رکھتے ہیں جائے درم داغِ جگر

الکرم العفو اے رب العلا
از طفیلِ حضرتِ خیر الوریٰ

جن کو گھر بیٹھے تماشے تھے ہزار
پھرتے ہیں وہ دربدر رسوا و خوار
عیش و عشرت تھا جنھیں لیل و نہار
یوں خزاں اب ہو گئی اُن کی بہار

عفو کن گر جرمے از کس سر زند
یارب آں کن کاں بقوت سے سزد

داغِ غم سینے پہ کھائے بیٹھے ہیں
فکر میں سر کو جھکائے بیٹھے ہیں
تھا جو سرمایہ لٹائے بیٹھے ہیں
ہاتھ دُنیا سے اُٹھائے بیٹھے ہیں

رحم کن بر بیکساں ای دادرس
آہ از دل بر لب آید ہر نفس

کی خدا نے یہ دُعا بارے قبول
ہو گیا کافور ایک ایک بوالفضول
یعنی پھر حکامِ عادل کا نزول
ہو گیا تسکینِ دلہائے ملول

کرد ہر کس شکرِ رب العالمیں
شد رہا از بندِ غم جانِ حزیں

پھر گیا پھر آسمانِ پُرجفا
مخبروں نے کر دیئے فتنے بپا
بے گنہ اور باگنہ پکڑا گیا
جس کی جو قسمت میں لکھا تھا ہوا

نیست شکوہ از سپہرِ کینہ جو
آنچہ در تقدیر بود آمد برو

اور ایسے فتنوں سے جو ڈرتے تھے
دمبدم توبہ کا وہ دم بھرتے تھے
پاس و حفظِ آبرو کو مرتے تھے
عمر کے دن اپنے پورے کرتے تھے

پادشاہا لطف کن بر ایں کساں

ہم بحفظ و ظلِ خود بخشی اماں

مدتوں کے بعد پھر فتنہ مٹا
اب اُسے حاکم سے ملتی ہی سزا
قید سے چھوٹے اسیرانِ بلا
جو ستاتا ہی کسی کو بے خطا

امن دہ ای داورِ روزِ جزا
پُر جفا را کن اسیرِ صد جفا

ابرِ حسرت دل پہ اپنے چھا گیا
ہائے قاضی اپنا پھانسی پا گیا
یہاں تو حسرت کو بھی رونا آگیا
عمر بھر افسردہ کو رُلوا گیا

آنچہ برمن کرد چرخِ بدنہاد
اینچنیں اندوہ کافر را مباد

مجھسا دُنیا میں نہیں اندوہ گیں
جانِ سنگیں رکھتا ہوں دل آہنیں
شغل کوئی مجھ کو جُز ماتم نہیں
ورنہ مر جاتا تڑپ کر بالیقیں

یا الٰہی لطف کن بر حالِ ما
رحمتِ خود بیں مبیں اعمالِ ما

غیرتِ باغِ جناں یہ شہر تھا
انتقامِ عیش و عشرت ہو چکا
یک بیک برباد جو ایسا ہوا
اب یہ ہی ہر شخص کی ہر دم دُعا

لطف کن بر اہلِ دہلی ای خدا
تا کہ باشد آب و آتش را بقا

دل کو افسردہ کے خوش کر ای خدا
درپئے ایذا ہیں حاسد جا بجا
رات دن یہ رنج میں ہیں مبتلا
دامِ مکر و کید سے اُن کے بچا

ہر بلائے صعب از وی دور دار
دشمنش را از غضب مقہور دار

اکرام۔ حکیم محمد مرزا خاں مرحوم دہلوی

پوچھ مت حالِ زیانِ دہلی — ہائے ہیں اور بیانِ دہلی
اب تو نکلا تیرا ای چرخ غبار — مل گئی خاک میں شانِ دہلی
دولتِ حسن کو غم نے لوٹا — چھپ گئے سیمبرانِ دہلی
بن کہے چہرہ کہے دیتا ہی — بیکسی ہائے کسانِ دہلی
خاک میں مل گئے الماسِ ہنر — کھود کر دیکھ تو کانِ دہلی
یہ بھی ویسا ہی ہوا چاہتا ہی — جیسے پہلا ہی نشانِ دہلی[1]
اب تو جز حسرت و افسوس و الم — کوئی آتا نہیں میانِ دہلی
گریہ کی سیل ہی یہ نہر نہیں — روتے ہیں پیر و جوانِ دہلی
نہ وہ صورت ہی نہ وہ زینت ہی — غدر تھا آفتِ جانِ دہلی
نام سے اس کے ہی ایک جز و آباد — اب ہی ویران جہانِ دہلی
فرطِ بارش نے گرائے اکرام — کچھ جو باقی تھے مکانِ دہلی

تجمل۔ حکیم تجمل حسین خاں مرحوم دہلوی

خلف ممتاز الدولہ نواب غلام رسول خاں۔ آغا جان عیش کے شاگرد تھے ۱۲۹۲ھ م
شتہ ہو پچاس سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

[1] پرانی دہلی کی طرف اشارہ ہی۔

صرف اک نام کو باقی ہے نشانِ دہلی
نہ وہ رفعت ہے نہ شوکت ہے نہ نشانِ دہلی

ہفت اقلیم میں اس شہر کی تھی دھاک بڑی
کوئی دنیا میں نہ تھا شہر بشانِ دہلی

ہر گلی کوچہ تھا اس شہر کا صد رشکِ ارم
غیرتِ خلد تھا ہر ایک مکانِ دہلی

سڑکیں وہ پاک کہ ہوں عارضِ خوبانِ محبوب
صاف جوں آئینہ ہر ایک دُکانِ دہلی

غیرتِ چشمۂ حیواں تھا ہر اک چشمۂ آب
رشکِ تسنیم تھی ہر نہرِ روانِ دہلی

گرچہ اب خاک سی اُڑتی ہے و لے اس پہ بھی
رو کشِ بادِ بہاری ہے خزانِ دہلی

چھین لیتے تھے بس اک نیم نگہ میں دل کو
آفتِ جان تھے وہ آفتِ جانِ دہلی

وہ ہنرمند کہاں اور کہاں اہلِ کمال
اُن کے مٹنے سے مٹی شوکت و شانِ دہلی

کون ایسا ہے کہ جس پر نہیں صدمہ اس کا
جگرِ ماہ پہ ہے داغِ زیانِ دہلی

ہائے رے حسرتِ دیدار کہ خارج شدگاں
گھڑیاں سر پہ ہیں اور ہیں نگرانِ دہلی

وہ گل اندام جو پھولوں میں پڑے تلتے تھے
ہوئے پامالِ خزاں آہ بسانِ دہلی

نہ وہ گانا نہ بجانا نہ وہ میلے ٹھیلے
اہلِ عشرت ہیں بنے سب مرثیہ خوانِ دہلی

سینہ کوبی ہے کبھی اور کبھی آہ و فغاں
لب پہ نالہ ہے کبھی گاہ بیانِ دہلی

احمدِ پاک کی خاطر تھی خدا کو منظور
ورنہ قرآں اُترتا بزبانِ دہلی

چاندنی چوک کا عالم نہ دریبے کا وہ حسن
خاص بازار کی زینت نہ وہ آنِ دہلی

کالے آئے تھے یہ کیا کالی بلا آئی تھی
ہو گئے خاک بسر خورد و کلانِ دہلی

ہائے رے حبِّ وطن صدمے اُٹھائے کیا کیا
اُس پہ بھی آن بسے لوگ میانِ دہلی

گھر چھٹا شہر چھٹا پر نہ چھٹے حضرتِ عشق
طرفہ معجون ہیں یہ پیر و جوانِ دہلی

شکر صد شکر کہ حکامِ عدالت گستر
باعثِ امن ہوئے آکے میانِ دہلی

پھر ہو منظور بدل زینت و رونق یہاں کی
۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ [۱]

شعر جانسوز یہ دو چار تجمل نے کہے
جی یہ چاہے ہو سُنے جاؤں بیانِ دہلی

ایضاً

مل گئے خاک میں سب غنچہ لبانِ دہلی
آگ لگ جائے تجھے بادِ خزانِ دہلی

چشم نمناک دل افسردہ ہو صد پارہ جگر
بیٹھے اس طرح سے ہیں غمزدگانِ دہلی

اور مت آگ لگا شمعِ خیالِ جاناں
خود جلے بیٹھے ہیں دل سوختگانِ دہلی

دربدر خوار پھرے مال لُٹا شہر چھٹا
پیٹیں کس کس کو بھلا ماتمیانِ دہلی

نہ محافل نہ مجالس نہ الگ گوشہ کوئی
بیٹھ کر روئیں کہاں نوحہ گرانِ دہلی

نہ وہ ناکو نہ پری چہرہ نہ مہ و لبِ بام
نہ وہ بازار نہ وہ سیر کنانِ دہلی

نہ طرحداروں کا بن ٹھن کے نکلنا سرِ شام
نہ وہ چشمک زنیِ ماہ رخانِ دہلی

نہ وہ عشوہ نہ وہ شوخی نہ وہ غمزہ نہ ادا
کچھ نئی وضع سے ہیں خوش وضعانِ دہلی

مسجدِ جامع کی رونق نہ وہ گدڑی کی بہار
نہ وہ زہاد خدا رس نہ بتانِ دہلی

سرنگوں ہوتے تھے یہاں دیکھ کے جن کو زاہد
اب خدا جانے کہاں ہیں وہ بتانِ دہلی

ہائے رے سوزِ محبت کہ پھکا جاتا ہوں
یاد جب آتے ہیں وہ شعلہ رخانِ دہلی

حال مستی سے جنھیں ہوش نہ تھا دنیا کا
فاقہ مستی میں وہ ہیں عشرتیانِ دہلی

چوکڑی بھولتے تھے دیکھ غزالانِ ختن
ایسے انداز کے تھے خوش نگہانِ دہلی

طعنہ زن ہووے زلیخا یہ یہاں کے عشاق
فخرِ یوسف یہ کریں کج کلہانِ دہلی

مشغلہ اپنا تجمل کرے کیا خاک رقم
ہمنشیں اس کے ہیں کل ماتمیانِ دہلی

[۱] ایک مصرعہ کتابت میں رہ گیا یعنی اصل میں نہیں ہے۔

ایضاً

پھر بندھا دل پہ خیالِ دہلی	پھر ہوا رنج و ملالِ دہلی
پھر نئے سرے سے طپش ہے دل کو	سرد کچھ پاتا ہوں حالِ دہلی
مٹ گیا عیش و تنعم سب کا	لُٹ گیا مال و منالِ دہلی
ڈھونڈھتی پھرتی ہیں آنکھیں ہر جا	کیا ہوئے اہلِ کمالِ دہلی
تھی غضب اس کی ترقی ہے ہے	آفت جاں ہے زوالِ دہلی
جان دیتے تھے جہاں کے دلبر	تھا عجب حسن و جمالِ دہلی
حاتم طائی چھپا زیرِ زمیں	دیکھ کر دستِ نوالِ دہلی
جس کو دیکھا اُسے خواہاں اُس کا	سب کے لب پر ہے سوالِ دہلی
خلد اک باغِ خزاں دیدہ ہے	کون کہتا ہے مثالِ دہلی
نہیں بچنے کا پڑے گا بے شک	چرخ کی جان پہ وبالِ دہلی
کانپا بس خوف سے مریخِ فلک	دیکھ کر جنگ و جدالِ دہلی
ابتدا جیسی ہوئی خوب ہوئی	دیکھئے کیا ہو مآلِ دہلی
بس تجمل کی دعا یہ ہے خدا	اب ترحم ہو بحالِ دہلی

ایضاً

پھرتے چلتے جو میں آنکلا بشہرِ دہلی	وہ مکاں مجھ کو نظر آئے نہ اُس جا وہ مکیں
نہ دُکانوں کی وہ رونق نہ وہ لطفِ بازار	نہ وہ خوبیِ سڑک اور نہ صفائی زمیں
نہ کٹوروں کی وہ جھنکار نہ شورِ خلقت	نہ پریزادوں کا وہ خُلق نہ حسن نمکیں
نہ وہ کوٹھوں کی سجاوٹ نہ وہ کمروں کی نمود	نہ کوئی ماہ لقا اور نہ کوئی زہرہ جبیں

سب طرف دیکھا نہ پایا کوئی واں راحت جاں
دلِ مضطر نے کسی جائے نہ پائی تسکیں

چرخِ بدکیش کو کیا کوسوں نہ چھوڑے اس نے
وہ نزاکت بھرے انسان وہ اہلِ تمکیں

لیسے ایسے تھے کہ اچھوں کو غش آجاتے تھے
کھول دیتے تھے جدھر اپنی وہ زلفِ مشکیں

خوں لایا انھیں جلادِ فلک نے کیا کیا
وہم سے کرتے نہ جو ہاتھ حنا سے رنگیں

ملنا دشوار رہا اب اُن سے تو ای پیکِ خیال
دلِ بیتاب کو کس طرح سے آجائے یقیں

لگ گئی کس کی نظر کون تھا ایسا کمبخت
کور ہو جائے الہٰی کہیں چشمِ بدبیں

باغ کی سمت جو آیا تو میں کیا دیکھتا ہوں
خاک سی اُڑتی ہے گل بوٹے کا واں نام نہیں

جس طرف دیکھا تو ایک ڈھیر تھا خار و خس کا
نہ تو نرگس تھی نہ سوسن نہ سمن نے نسریں

سو سو ٹھکھیلی سی چلتی تھی جہاں بادِ نسیم
بادِ صرصر کا بھی دیکھا تو نہ تھا نام کہیں

عندلیبانِ چمن چہچہے کرتے تھے جہاں
ایک چڑیا بھی نہ دیکھی ہاں کرتی چیں چیں

تھی جہاں نغمہ سرائی طیورِ گلشن
مرثیہ خوانوں کی سی آئے ہے آوازِ حزیں

آشیانے ہیں ہاں زاغ و زغن کے صدہا
تھے جہاں سیکڑوں طاؤس ہزاروں شاہیں

چوب بوسیدہ کا انبار پڑا تھا کہ جہاں
سروِ نوخیز کھڑے رہتے بزیب و تزئیں

تودہ تودہ تھا پڑا ہائے وہاں بول و براز
جس جگہ رہتی تھی آراستہ بزمِ رنگیں

جھجے قہقہے میں جن کی گزرتی اوقات
مثل ماتم زدہ بیٹھے نظر آئے غمگیں

دیکھ یہ حال بصد حسرت و صد یاس و الم
بس تجمل نے پڑھا مطلعِ ثاقب وہیں

ای کہن سال فلک دشمنِ جانِ دہلی
کیا ترے ہاتھ لگا کھو کے نشانِ دہلی

تشنہ محمد علی مرحوم دہلوی

خوش فکر مگر آزاد منش اور رند مشرب تھے۔ پہلے ذوق مرحوم سے اور بعد کو عیش مرحوم سے اصلاح لیتے تھے ۱۲۸۲ھ میں بمقام ریاست الور انتقال ہوا (بعض اوقات برہنہ بھی رہتے تھے)

عجیب کوچۂ رشکِ جناں تھا دہلی کا — بہشت کہتے ہیں جس کو مکاں تھا دہلی کا
دماغ بر سرِ ہفت آسماں تھا دہلی کا — خطاب خطۂ ہندوستان تھا دہلی کا

غضب ہے اُس کو کوئی شادماں نہ دیکھ سکا
زمیں نہ دیکھ سکی آسماں نہ دیکھ سکا

ہزاروں زلفِ پریوش کے یاں تھے سودائی — ہزاروں میکش و میخوار مست صہبائی
شرابِ عیش پلاتا تھا چرخِ مینائی — قبول کرتے تھے اس در کی سب جبیں سائی

جو آتا تھا سو وہ ہو رہتا تھا اِسی گھر کا
زمیں کی ناف ہے کعبہ ہے بطنِ مادر کا

یہاں کی خاک میں کیفیت ابرِ باراں کی — یہاں کے آب میں تاثیر آبِ حیواں کی
یہاں کی بادِ بہاری ہوا زمستاں کی — یہاں کی آگ میں گرمی تھی شعلہ ویاں کی

ہر ایک شخص کے حق میں یہ شہر اچھا تھا
مریضِ عشق کے بھی واسطے مسیحا تھا

وہ تختِ سلطنت و بارگاہ سلطانی — کہ جس میں بیٹھتے تھے آ کے ظلِ سبحانی
پروں سے سر پہ ہما کرتا تھا مگس رانی — بجا اس اوج پہ تھا دعوئِ سلیمانی

ہر ایک قصر کو دعویٰ تھا طاقِ کسریٰ کا
دماغ عرش پہ تھا قلعۂ معلےٰ کا

کسی زمانہ میں ایسا تھا یاں کا تخت نشیں
خراج دیتے تھے سب بادشاہ روئے زمیں
خطا و ملکِ ختن سب تھے اُس کے زیرِ نگیں
مدام کانپتے تھے اُس سے چین اور ماچین

دیارِ ہند تھا مشہورِ خلق نام اُس کا
چراغ روم سے جلتا تھا تا بہ شام اُس کا

زحل کی آنکھ پڑی اتفاق سے ناگاہ
تمام ہو گیا تاراج ملک و مال اور جاہ
گدا سے ہو گئے بدتر غریب شاہنشاہ
رعیت اُن کی ہوئی اُن سے بھی زیادہ تباہ

وہ ساہوکار نہ تھا جس کی ساکھ میں بٹا
اب اُس کے نام پہ لگتا ہے لاکھ میں بٹا

یہ لوگ کہنے لگے آگ اس وطن کو لگے
نظر نہ ایسی الٰہی کسی چمن کو لگے
سُنانے اہلِ سخن صاحبِ سخن کو لگے
جو ایک تار بھی باقی ہو تو کفن کو لگے

تمام شہر تلنگوں نے آ کے لوٹ لیا
مثل ہے بھوکوں کو ننگوں نے آ کے لوٹ لیا

ملا یہ حکم کہ سب لوگ یاں سے ٹل جائیں
اسی میں خیر ہے جو شہر سے نکل جائیں
دبے ہیں نقچے تو دکھلا کے یہاں بغل جائیں
جو کچھ ہو چھوڑ یہاں صاحبِ بدل جائیں

نہ سر پہ ٹوپی ہے اُن کے نہ پاؤں میں جوتی
بغل میں طوطی کا پنجرا نبی جی بھیجو جی

میانِ راہ کھڑے تھے وہ رہزنِ بے پیر
کہ جن کے ہاتھ میں لاٹھی تھی مثلِ گرزِ نکیر

یہ کہہ رہے تھے کہ آگے بڑھو صغیر و کبیر
کہاں سے کھینچ کے لائی تمھیں کہاں تقدیر

سب اُن کے خوف سے کرتے تھے آہ و نالے لوگ
مثالِ غولِ بیاباں تھے گاؤں والے لوگ

گرہ ٹٹولی کسی کی کمر پہ ڈالا ہاتھ
ہر ایک مضطر و خستہ جگر پہ ڈالا ہاتھ
پدر کو چھوڑ دیا تو پسر پہ ڈالا ہاتھ
جو سر برہنہ تھا اُس کے بھی سر پہ ڈالا ہاتھ

الٰہی ہاتھ نہ ٹوٹے ستم شعاروں کے
کہ ہاتھ دھو کے پڑے پیچھے خاکساروں کے

یہاں جو آن کے دیکھی تو دار کی صورت
وہ دار کہیئے جسے ذوالفقار کی صورت
مٹا دی چشمِ زدن میں ہزار کی صورت
نظر پڑی نہ کسی بے قرار کی صورت

برنگِ تیرِ شہاب آگ میں جلے لاکھوں
سپردِ دار و رسن ہو گئے گلے لاکھوں

مکاں کو آکے جو دیکھا تو لامکاں ہے وہ
جہاں نہ چین کبھی بیٹھے اب آشیاں ہے وہ
جو شہر یار کو پوچھا کہو کہاں ہے وہ
تو یہ سنا کہ کھنڈر دیکھ لو نشاں ہے وہ

نہ اہلِ شہر رہے اور نہ شہر یار رہا
رہا تو نام ہی خالق کا برقرار رہا

رہی نہ جنسِ محبت کی اب خریداری
جو یوسف آئیں تو ہو تو بھی گرم بازاری
اٹھائے کون حسینوں کی ناز برداری
لگائے دل کو کوئی جان کس کو ہے بھاری

بقولِ شخص عجب ملکِ حسن بستی ہے
کہ دل سی چیز یہاں کوڑیوں کو سستی ہے

کسی کا دل نہیں اس دور میں ٹھکانے سے
رہی نہ گانے سے شوق اور نہ بجانے سے
غرض نہ غیر سے مطلب نہ ہے یگانے سے
وفا و مہر تلک اُٹھ گئی زمانے سے

کہاں سے لائیں وہ پہلی سی اب وفا معشوق
اسی سبب سے ہیں مشہور بے وفا معشوق

کوئی کہے کہ تپِ غم کی بس کہ شدت ہے
تو یوں کہیں کہ ہمیں آپ ہی حرارت ہے
چڑھا ہوا ہے بخار آج کل یہ نوبت ہے
تم اپنا کام کرو۔ جاؤ تم کو رخصت ہے

مریض جا کے کرے کیا کہ طعن کرتے ہیں
طبیب اپنا مرض خود بیان کرتے ہیں

جو شعر کہتے ہیں اور لوگوں کو سناتے ہیں
وہ بیٹھے رہتے ہیں آتے ہیں اور رنجاتے ہیں
جو قدردان نہیں اپنا کسی کو پاتے ہیں
تو دل ہی دل میں وہ خونِ جگر کو کھاتے ہیں

غزل کا ذکر نہ چرچا کسی یگانے سے
مذاقِ شعر و سخن اُٹھ گیا زمانے سے

ثاقب۔ نواب شہاب الدین احمد خاں مرحوم دہلوی

خلف اکبر نواب ضیاء الدین احمد خاں والی لوہارو۔ وہ رئیس اعظم دہلی شاگرد مرزا غالب ۲ محرم الحرام ۱۲۸۶ھ مطابق ۹ اپریل ۱۸۶۹ء بعمر ۲۹ سال انتقال ہوا۔

ہے کہن سال فلک دشمنِ جانِ دہلی
کیا ترے ہاتھ لگا کھو کے نشانِ دہلی
حیف صد حیف کہ ڈھی شاہجہانی تعمیر
وائے صد وائے نہیں شوکت و شانِ دہلی
وہاں قلعہ ہے نہ دریبہ نہ سڑک پھر کیونکر
دلی والوں کو ہو جنت پہ گمانِ دہلی
اس کی ویرانی سے آباد ہوئے اور بلاد
ہے بہارِ چمنِ دہر خزانِ دہلی
اہلِ دہلی نہ کریں بخت کا شکوہ کیونکر
بخت خاں جی ہوئے جب باج ستانِ دہلی

سحر آہنگ مغنی تھے ہزاروں او راب — کچھ جو باقی ہیں سو ہیں مرثیہ خوانِ دہلی

حاکمِ عادل و دانا کو خدا نے بھیجا — تب یہ آباد ہوئے چند مکانِ دہلی

کون وہ داورِ جم مرتبہ کوپر صاحب — کہ جسے خلق کہے شاہجہانِ دہلی

شہر والوں کو یہی وردِ زباں ہے شب و روز — کہ سلامت رہے یہ فیض رسانِ دہلی

پھر وہی مسجدِ جامع کے ہے بازار کی دھوم — پھر ہے آراستہ ہر ایک مکانِ دہلی

پاس مسجد کے شفاخانہ ہے ایسا کہ جسے — ہے بجا کہیے اگر روحِ روانِ دہلی

قلعہ میں ہے وہ پریزاد عجائب خانہ — کہ صنم خانۂ چیں ہے نگرانِ دہلی

چاندنی چوک بگڑ کر وہ بنا از سرِ نو — کہ کہیں گے ہم اسے بختِ جوانِ دہلی

چوک کے باغ میں وہ رنگ ہے آرائش کا — کہ قسم کھائے ہے فردوس بجانِ دہلی

اہلِ ایراں یہ غزل سن کے کہیں گے بیشک
بود ثاقب مگر از اہلِ زبانِ دہلی

حسامی۔ مرزا حسام الدین حیدر مرحوم دہلوی

ان کے والد کا نام مرزا خانی تھا۔ فکرِ معاش سے تعلیم کی مہلت نہ ملی۔ موزونیِ طبع سے شعر کہہ لیتے تھے۔ موسیقی میں بھی دخل تھا اور اپنا کلام خود گاتے تھے۔ داستان گوئی اور جلاکاری ذریعۂ معاش تھا۔ سنہ ۱۸۸۲ء مطابق سنہ ۱۳۰۰ھ میں زندہ تھے۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے — کروں غم ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے

وہ جو شہر دلی یہ تھا چمن کہ تھا سب طرح کا یہاں امن — وہ خطاب اس کا تو مٹ گیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے

یہ رعایا ہند تباہ ہوئی کہو کیا کیا ان پہ جفا ہوئی — جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ تو قابلِ دار ہے

شب و روز پھولوں میں جو تُلیں نکیوں خاک غم سے وہ چھپ گھلیں
ملے طوق قید میں جب انھیں کہا بڑھ کے گل کے یہ ہار ہے

جو سلوک کرتے تھے اوروں سے اب ہیں وہ دیکھو کس برے طور سے
وہ ہیں تنگ چرخ کے جو ستائے ہا تن پہ اُن کے نہ تار ہے

یہ جو بوئے تھے پیڑ ببول کے ہیں اُنھیں میں آج پھل لگے
جیسے جیسے ہم نے گناہ کئے یہ انھیں گناہوں کا بار ہے

پڑی آگ کے جانوں بیچ ایسی بن کے نستے ہوئے سبھی بھولے ہرن
جسے دیکھتا ہوں پڑا ہوا یہ گلے میں اشکوں کا ہار ہے

یہ وبال تن پہ ہی سر مرا انہیں جان جانے کا ڈر ذرا
بچے غم سے نکلے جو دم مرا مجھے اپنی زندگی بار ہے

یہاں حال تنگ جو سب کا ہے یہ کرشمہ قدرتِ رب کا ہے
یاں ہمارے ہیں تو خزاں ہوئی واں خزاں اُنھوں کو بہار ہے

یہ ستم کسی نے بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لاکھوں کو بے گنہ
ولے کلمہ گویوں کی طرف سے ابھی اُن کے دل پہ غبار ہے

نہ تو دشمنائی ہے غیر میں نہ ہے اپنا یاں کوئی ہمدم
چلا تیر اجل کا بھی شہر میں کیا لاکھوں کا جسنے شکار ہے

دیا جس نے غم ہے یہ برملا تو خوشی بھی دیگا وہی خدا
بھلا کون یہ نہیں جانتا کہ خزاں کے پیچھے بہار ہے

یہ زمانہ وہ ہے برا فلک چلو بچ کے سب سے الگ الگ
نہ رفیق کوئی کسی کا یاں نہ کسی کا کوئی بھی یار ہے

کیا حسامی ڈر تجھے حشر کا جو خدا رکھے تجھے برملا
تجھے ہے وسیلہ رسول کا کہ وہ تیرا حامیِ کار ہے

حالی۔ مولنا الطاف حسین مرحوم پانی پتی

والد کا نام خواجہ ایزد بخش انصاری تھا سنہ ۱۸۳۷ع میں پیدا ہوئے پہلے شیفتہ مرحوم سے اور بعد کو مرزا غالب مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ ۴۰-۴۵ سال کی مشق سخن کے بعد شاعری کی روش بدل کر "مدو جزر اسلام" مشہور اور مقبول مسدس لکھا۔ ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۱۴ع م سنہ ۱۳۳۲ھ انتقال کیا۔ یہ غزل شرکت مشاعرہ کی آخری یادگار ہے۔ اس کے بعد مشاعرے میں غزل نہیں پڑھی یہ غزل دلی پیاری کا مرثیہ ہے اور بس

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز
دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

عشق بھی تاک میں بیٹھا ہی نظر بازوں کی   دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز
زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی   زد میں تیر صفِ مژگاں کی نہ جانا ہرگز
چاہت اک طلعتِ مکروہ ہی برقع میں نہاں   کسی دلالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے   تو جوانی میں نہ یہ روگ بسانا ہرگز
جتنے رہنے تھے ترے ہوگئے ویراں ای عشق   آکے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز
کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدر شناس   قدر رہیاں رہکے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز
تذکرہ دہلی مرحوم کا ای دوست نہ چھیڑ   نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا ای بلبل   ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
ڈھونڈھتا ہی دلِ شوریدہ بہانے مطرب   درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی   کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا ای چشم   دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز
لیکے داغ آئے گا سینے پہ بہت ای سیاح   دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک   دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو   ای فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز
وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انھیں بھول گئے   ایسا بدلا ہی نہ بدلے گا زمانا ہرگز
جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں   نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز
ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا ای چرخ   ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز
یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہی   ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز
آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہی ساقی   بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے ای دورِ زماں — نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز
یہاں سے رخصت ہوئے ہیں ای عیش و نشاط — نہیں اس دور میں یہاں تیرا ٹھکانا ہرگز
کبھی ای علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلی — ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی یارو — یاد کر کر کے اُسے جی نہ کڑھانا ہرگز
غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق — اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو — ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز
داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں — نہ سُنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر — اب نہ دیکھوگے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں۔ بزمِ سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

داغ۔ نواب مرزا خاں مرحوم۔ دہلوی

سلطان الشعرا۔ بلبلِ ہندوستان۔ جہاں اُستاد۔ ناظم یار جنگ۔ دبیر الدولہ فصیح الملک بہادر ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء دہلی محلہ بلی ماراں میں پیدا ہوئے ۱۱-۱۲ برس کی عمر میں سب سے پہلی غزل نواب شیفتہ مرحوم کے مشاعرے میں پڑھی۔ قلعہ چھوڑنے کے بعد ۴۰ سال ریاست رامپور میں رہے اور نواب رامپور کے ساتھ حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے ۱۳۰۵ھ م ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد پہنچے ۶ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ م ۱۸۹۴ء سے بحیثیت اُستاد نظام ایک ہزار روپیہ وظیفہ مقرر ہو گیا اور دورانِ اُمیدواری کی تنخواہ بھی اسی حساب سے ملی۔ ۱۵ سال تک حیدرآباد رہ کر ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ م [illegible]

مطابق ۱۰ فروری ۱۹۰۵ء کو آٹھ روز مرض فالج میں مبتلا رہ کر حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ وہیں یوسف شریف صاحب کی درگاہ میں دفن کیے گئے۔

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلی — بہشت و خلد میں بھی انتخاب تھی دلی
جواب کاہے کو تھا لاجواب تھی دلی — مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلی
پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

یہ شہر وہ ہے کہ ہر انس و جان کا دل تھا — یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدردان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا — یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا
رہی نہ آدمی یہاں سنگ و خشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

یہاں کی شام تھی مانند صبح نورانی — یہاں کے ذرہ میں تھی مہر کی درخشانی
یہاں کے سنگ سے تیرہ تھا لعل رمانی — یہاں کی خاک سے ہوتا تھا آئینہ پانی
یہ شہر وہ ہے کہ سایہ بھی نور تھا اس کا
چراغ رشک تجلی ظہور تھا اس کا

فلک تھا خوبی حسن و جمال کا دشمن — صباح عشرت و شام وصال کا دشمن
عدو ہے اہل کمال اور کمال کا دشمن — غرض کہ اب تو ہوا جان و مال کا دشمن
یہ مفت بر جو تلاشی ہیں نقد جاں کے لیے
خضر بھی رو دیں گے اب عمر جاوداں کے لیے

خدا پرستی کے بدلے جفا پرستی ہے — جو مال مست تھے اب ان کو فاقہ مستی ہے

بجائے ابرِ کرم مفلسی پرستی ہے
بتنگ جینے سے ہیں ایسی تنگدستی ہے

غضب میں آئی رعیت بلا میں شہر آیا
یہ پوربی نہیں آئے خدا کا قہر آیا

زباں سے کہتے ہوئے دین دین آئے لعیں
یہ جانتے ہی نہ تھے چیز کیا ہے دینِ متیں
جو ماتا دین تھا کوئی تو کوئی گنگا دیں
کیئے ہیں قتل زن و بچہ کیسے کیسے حسیں

روا نہ تھا کسی مذہب میں جو وہ کام کیا
غرض وہ کام کیا کام ہی تمام کیا

فلک نے قہر و غضب تابک تاک کر ڈالا
یکایک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا
تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
غرضکہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا

جلیں ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھچیں ہیں کانوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

عجیب شکل گل و گلستاں نظر آئی
جب اٹھ کے تا مژۂ خونچکاں نظر آئی
پڑیں جدھر کو نگاہیں خزاں نظر آئی
تو کوئی عیش کی صورت نہ یاں نظر آئی

وہ گلرخانِ سمن بر کے قہقہے نہ رہے
وہ بلبلانِ خوش الحاں کے چہچہے نہ رہے

کھلایا زہر ستمگر نے پان کے بدلے
نصیب دار ہوئی ہے نشان کے بدلے
پلایا خونِ جگر بیچوان کے بدلے
ملا نہ گور گڑھا بھی مکان کے بدلے

عداوتِ فلکِ کینہ ساز تو دیکھو
اور اس پہ اس ستم آرا کے ناز تو دیکھو

لہو کے چشمے ہیں چشمِ پُرآب کی صورت
شکستہ کاسۂ سر ہیں حباب کی صورت
لٹے ہیں گھر دلِ خانہ خراب کی صورت
کہاں یہ حشر میں تو یہ عذاب کی صورت

زبانِ تیغ سے پرسش ہے دادخواہوں کی
رسن ہے طوق ہے گردن ہے بے گناہوں کی

زمیں کے حال پہ اب آسمان روتا ہے
ہر اک فراقِ مکیں میں مکان روتا ہے
نہ طفل و عورت و پیر و جوان روتا ہے
غرض یہاں کے لیے اک جہان روتا ہے

جو کہیے جوششِ طوفاں کہیں کہی جاتی
یہاں تو نوح کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

بزنگِ بوئے گل اہلِ چمن چمن سے چلے
غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پوچھو زندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے
قیامت آئی کہ مُردے نکل کفن سے چلے

مقامِ امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

یہ خاصیت تو نہ رکھتی تھی زہر کی گرمی
یہاں تھی شعلہ عذارانِ شہر کی گرمی
نہ دیکھیں جو نگہِ چشم و قہر کی گرمی
اُٹھائیں ہائے وہ جلتی دوپہر کی گرمی

تپش سے ایک بیابانِ آفتاب ہوئی
زمین مگر کرۂ نار کا جواب ہوئی

جگہ جگہ تھے زمیندار دار کی صورت
چڑھے ہی آتے تھے سر پہ بخار کی صورت
بلا سے کم نہ تھی ہر ایک گنوار کی صورت
چھپی نہ اُن سے پر اہلِ دیار کی صورت

کسی جگہ جو کوئی ہو کے بے قرار آیا

تو اہلِ قریہ یہ بولے کہ لو شکار آیا

زبان بدلیں تو صورت بدل نہیں آتی
ملیں جو خاک بھی منہ پر تو مل نہیں آتی
کسی طرح کسی پہلو سے کل نہیں آتی
پکارتے ہیں اجل کو اجل نہیں آتی

جو سر کو پھوڑیں تو پتھر پرے سرکتے ہیں
جو لوٹیں کانٹوں پہ کانٹے الگ کھسکتے ہیں

بنا ہے خالِ سیہ رنگ مہ جمالوں کا
دوتا ہوا ہے قدِ رست نونہالوں کا
جو زور آہوں کا لب پر تو شور نالوں کا
عجیب حال دگرگوں ہے دلّی والوں کا

کوئی مراد جو چاہی حصول بھی نہ ہوئی
دعائے مرگ جو مانگی قبول بھی نہ ہوئی

پیادہ پا ہوئے وہ شہسوار صد افسوس
لہو کے گھونٹ پئیں بادہ خوار صد افسوس
ذلیل و خوار ہوئے اہلِ وقار صد افسوس
ہزار حیف دلِ بے قرار صد افسوس

جھکے ہیں بارِ الم سے تنے ہوئے کیسے
بگڑ گئے ہیں یکایک بنے ہوئے کیسے

پئے محاسبہ پرسش ہے نکتہ دانوں کی
تلاش بہرِ سیاست ہے خوش بیانوں کی
جو نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی
کہ حکمِ عام ہے بھرتی ہے قیدخانوں کی

یہ اہلِ سیف و قلم کا ہو جبکہ حال تباہ
کمال کیوں نہ پھرے دربدر کمال تباہ

غضب ہے بختِ بد ایسے ہمارے ہو جائیں
کہ ہیں جو لعل و گہر سنگ پارے ہو جائیں
جو دانے چاہیں تو خرمن شرارے ہو جائیں
جو پانی مانگیں تو دریا کنارے ہو جائیں

پئیں جو آبِ بقا بھی تو زہر ہو جائے
جو چاہیں رحمتِ باری تو قہر ہو جائے

جہاز ایسا تباہی میں آگیا اپنا
ملا نہ تختہ ترا تک کہیں پتا اپنا
رہا نہ آہ زمانے میں آشنا اپنا
بجز خدا کے نہیں کوئی ناخدا اپنا

کسی سے ڈوبے ہوئے ایسے کب نکلتے ہیں
یہاں سے حضرتِ الیاس بچکے چلتے ہیں

یہ وہ جگہ ہی کہ عبرت پہ عبرت آتی ہی
یہ وہ جگہ ہی کہ شامت پہ شامت آتی ہی
یہ وہ جگہ ہی کہ آفت پہ آفت آتی ہی
یہ وہ جگہ ہی کہ حسرت پہ حسرت آتی ہی

یہ وہ جگہ ہی جہاں بیکسی بھی ڈر جائے
یہ وہ جگہ ہی اجل خوف کھا کے مر جائے

کہاں تک آہ لکھوں اس کا حال بربادی
لکھوں کہاں تک اس آسماں کی جلادی
کسی کو قیدِ محن سے نہیں ہی آزادی
کہ داغ داغ ہی ہر دل ہر ایک فریادی

الٰہی پھر اسے آباد و شاد دکھلا دے
الٰہی پھر اسے حسبِ مراد دکھلا دے

ایضاً

یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمانِ دہلی
تھا مرا نام و نشاں نام و نشانِ دہلی
لے گئے لوٹ کے اب شوکت و شانِ دہلی
ہو رہے پہلے اڑاتے تھے زبانِ دہلی
دلی والوں کے لیئے تازہ بنے گی جنت
لے گئے سر پہ ملک تختہ مکانِ دہلی

گرم ہنگامہ ہوئے لالہ رخانِ پنجاب
گل کھلائے ہیں نئے تو نے خزانِ دہلی

رشکِ شمشاد تھا ہر خوش قد و ہر خوش رفتار
سروِ آزاد تھا ایک ایک جوانِ دہلی

عارضِ صاف تھا ایک ایک مصفا بازار
چشم پر جلوہ تھی ایک ایک دکانِ دہلی

اس سے بڑھ کر کوئی محشر میں نہیں طولِ حساب
بس یہی ہوگا کہ ہم اور بیانِ دہلی

دیدیا فوج کو حکام نے انعام میں سب
گنجِ قاروں سے فزوں گنجِ نہانِ دہلی

قلعہ کی بیچ کا میدان پھر اس میں وہ سڑک
کہ بدل کہیئے جسے ہر دل و جانِ دہلی

گر یہ میدان نہ ہوتا تو ٹھکانا ہی نہ تھا
تنگ ہی رہتی سدا روحِ روانِ دہلی

روکش سدِّ سکندر اسے کہیئے تو بجا
فتح گڈھ ہی جو پہاڑی یہ قرانِ دہلی

یا خدا مسجد جامع کا رہے نام بلند
کعبہ والے کہیں وہ آئی اذانِ دہلی

نیّر و غالبؔ و آزردہ سے پھر لوگ کہاں
داغؔ اب یہ ہیں غنیمت ہمہ دانِ دہلی

راقم - مرزا حسین علی خاں مرحوم - دھلوی

عارفؔ مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ شدتِ رنج یا کثرتِ غم سے ایک ہی مطلع کہا مگر بہت ہی جل کر کہا ۱۸۵۷ء میں جب یہ مطلع لکھا زندہ تھے۔

مٹ گیا خوب ہوا نام و نشانِ دہلی
کس کی یا پوتی بنے مرثیہ خوانِ دہلی

رضوان شمشاد علی بیگ خاں مرحوم دہلوی

سالکؔ دہلوی کے بڑے بھائی اور مرزا غالبؔ کے شاگرد تھے بلند پرواز شاعر تھے۔

۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء میں بعمر ۴۴ سال انتقال کیا۔

میری فریاد سے ظاہر ہے بیانِ دہلی
دلِ خوں گشتہ پہ ہے داغ زبانِ دہلی

ہم کو معلوم تصور سے ہوا ہے اتنا
عرش سے بڑھ کے ہے کچھ رفعتِ شانِ دہلی

کحلِ مازاغ لگاؤ تو کھلے راز کہ ہے
چیدۂ عالمِ ارواح جہانِ دہلی

شہرِ دہلی کو اگر ہند کا دل کیجیے فرض
حضرتِ قلعہ کو ٹھیرائیے جانِ دہلی

ہم نے پائے نہ ہنرمند کہیں دلی سے
ہم نے دیکھا نہ کوئی شہر بسانِ دہلی

چھوڑ دے زہد کو زُنّار برہمن لے زاہد
اک نظر دیکھے جو اندازِ بتانِ دہلی

حُسنِ یوسف جو نہ دیکھا ہو کسی نے دیکھے
ہر دکاں دار کے ہے پاس میانِ دہلی

ہم کو رونا تو یہی ہے کہ ہوئے ہم برباد
اور اغیار ہوئے عشرتیانِ دہلی

گر نہ ہوں ہم تو ہو بازار میں گرمی کیونکر
ہم ہی تھے جنس گراں بارِ دکانِ دہلی

دستِ یغمائے فلک سے نہ رہا کچھ باقی
ہاں مگر واسطے نالے کے زبانِ دہلی

ہے عدم کی تجھے منظور خدایا رونق
کہ اُٹھایا اُنھیں جو لوگ تھے جانِ دہلی

کیا ہیں درکار مکاناتِ ارم میں یا رب
کہ اُٹھے جاتے ہیں دلی سے مکانِ دہلی

انتہا گم شدگی کی ہے عدم ہو جانا
ہم نے پایا نہ عدم میں بھی نشانِ دہلی

کیا بتاؤں کہ ہوں کس صدمے سے رضواں خاموش
دلِ خوں گشتہ پہ ہے داغ زبانِ دہلی

سالک۔ مرزا قربان علی بیگ خاں مرحوم دہلوی

حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں تربیت پائی۔ ابتدا میں مومن کے اور بعد کو غالب کے شاگرد ہوئے۔ آخر میں بزمانۂ قیام حیدر آباد ۱۲۹۶ھ م ۱۸۷۹ء میں وہیں انتقال ہوا۔

جہاں میں شہر ہیں جتنے جہاں جہاں آباد
اُجڑ کے یاں سے نہ پوچھو ہوا کہاں آباد
بس اُن بلاد میں تھا منتخب جہان آباد
گیا عدم کو دوبارہ ہوا وہاں آباد
فلک نے کس سے کہوں کیوں اُٹھا لیا اُس کو
ارم کا قصر سمجھ کر اُٹھا لیا اُس کو

زبسکہ رکھتے ہیں دل سے عزیز سب اُس کو
سنا ہی بستے ہوئے آسماں پہ جب اُس کو
زمیں پہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں روز و شب اُس کو
بلند شہر کہیں کیوں نہ لوگ اب اُس کو
یہ اُٹھ گیا ہے اور اُٹھا نشانِ رفعت ہے
بلند شہر کو کیا ورنہ اس سے نسبت ہے

زمین پست یہاں کی تھی آسماں منظر
یہاں کی خاک تھی اکسیر سے بھی کچھ بہتر
ہر ایک ذرہ یہاں کا تھا مہر کا ہمسر
یہاں کی آب میں آبِ حیات کا تھا اثر
نسیم خلد سے بہتر سموم تھی یاں کی
یہ وہ چمن ہے کہ دنیا میں دھوم تھی یاں کی

ہر اک مکان یہاں کا تھا ایک مکانِ سرور
ہر اک دکان یہاں کی تھی اک کانِ سرور
ہر ایک کوچہ یہاں کا تھا اک جہانِ سرور
غرضکہ شہر نہ تھا تھا یہ ایک کانِ سرور
جدھر کو دیکھیے آواز بربط و نے ہے
نہ جانتا تھا کوئی رنج و غم کہ کیا شے ہے

یہ شہر کس لیے برباد ہو گیا یارب
یہاں کے لوگوں سے کیا ہو گئی خطا یارب
لگی کسی کی یہ کیا ایسی بددعا یارب
ہوئے ہیں کس لیے یہ مورد جفا یارب
[illegible]

وگرنہ ہوتے نہ ہرگز ہزارے دار ثقات

چلی تھی دہر میں گویا ہوا یہ چوبائی
کہ فوجِ باغیہ چاروں طرف سے یاں آئی
تمام شہر کی خوب آگے خاک اُڑوائی
یہ بادِ تند تھی خاشاک کی تمنائی

رہی نہ خاک بھی امن و امان کی صورت
کچھ اور ہوگئی سارے جہان کی صورت

یہ انقلاب ہے یا ہے قیامتِ صغرا
کوئی نہیں ہے کہ جس کے رہے ہوں ہوش بجا
ہوئی ہے آدمی کی شکل شہر میں عنقا
بنا ہے ہو کا مکاں بس ہر اک گلی کوچہ

ہوئے ہیں لوگ یہاں کے کہاں کہاں آباد
ہر ایک گاؤں بنا ہے مگر جہاں آباد

کسی کے لب پہ ہے نالہ کسی کی چشم ہے تر
کسی کا چاک گریباں ہے اور کوئی مضطر
کسی کا ہاتھ ہے دل پہ کوئی ہے تھامے جگر
غرضکہ رنج سے خالی نہیں ہے کوئی بشر

بجائے زمزمہ ہر جائے شیونِ غم ہے
محلِ عیش تھا یا اب سرائے ماتم ہے

مکاں شکستہ ہیں مانندِ خاطرِ مایوس
اُجاڑ کوچے بسانِ دلِ الم مانوس
وہ شکل ہی نہ رہی شہر ہو گیا معکوس
ستم کیا فلکِ بدشعار نے افسوس

یہ وہ جگہ ہے جسے دیکھنے کو خلقت آئے
اور اب جو دور سے دیکھے کوئی تو عبرت آئے

سمجھ کے اپنا ٹھکانا گئے جہاں ہم لوگ
ذلیل واں سے زیادہ ہوئے وہاں ہم لوگ
بنے ہیں طائرِ گم گشتہ آشیاں ہم لوگ
پھرے ہیں امن کے طالب کہاں کہاں ہم لوگ

زمین ہو گئی دشمن نہ پائی جائے ثبات
ٹھہر سکا نہ کسی جائے اپنا پائے ثبات

وہ لوگ کھاتے تھے جن کے نشاط کی قسمیں
محل میں رہتے تھے یاب ہوئے ہیں محبس میں
ہوئے ہیں طالعِ ناسازگار کے بس میں
نہ تاب دل میں ہے طاقت تنِ جانِ بیکس میں

جو تشنہ لب ہوں تو آبِ دمِ سناں موجود
جو گرسنہ ہوں تو کھانے کو گولیاں موجود

ہوئے ہیں قتل جو بیجرم لوگ دلی کے
کیا جنابِ الٰہی میں عرض رضواں نے
بہشت چاہیے پہلے انھیں قیامت سے
کہ آج کل درِ فردوس کس طرح سے کھلے

ملا جواب کہ دلی کو لاؤ اٹھوا کر
اور اس گروہ کو اس میں بساؤ لے جا کر

وہ جن کی طبع کہ آسودگی پہ مائل ہے
اٹھائیں ایک قدم بھی اگر تو مشکل ہے
پیادہ کیونکہ چلیں ناقہ ہے نہ محمل ہے
قدم کہے کہ ٹھہر جاؤ یہ ہی منزل ہے

سروں پہ بوجھ ہے گٹھری کا لڑکھڑاتے ہیں
بس اپنے جی کی طرح بیٹھ بیٹھ جاتے ہیں

لکھوں میں پردہ نشینوں کا حال کیا یہ ہے
نہ آئی جن کی کبھی در تلک صدا ہی ہے
بیان مجھ سے ہو کیونکہ یہ ماجرا ہی ہے
نکل کے گھر سے چلیں وہ پیادہ پا ہی ہے

کبھی نہ غصہ میں بھی جا سکے جو باہر ہوں
غضب ہے یہ کہ وہ بے پردہ اور چادر ہوں

ہجومِ مسجدِ جامع کا کیا کروں اظہار
صفِ ملائکہ ہوتی جہاں نماز گزار

ہر ایک صف میں نہ رہتا مصلیوں کا شمار
اب اس کو دور سے بھی دیکھنا ہوا دشوار

نماز ہے نہ اذاں ہے نہ کوئی جاتا ہے
جب اس کو دیکھیے خالی تو جی بھر آتا ہے

وہ اس کے گرد کے بازار اور وہ زینت
ہجوم خلق سے ہر روز ایک نئی صورت
کہ جس کے دیکھنے سے طبع کو ہوا کی فرحت
یہاں سے جائیے کبھی میلہ میں تو ہو نفرت

الٰہی کیا ہوئے اجناس رنگ رنگ کے ڈھیر
پڑے ہوئے ہیں گل و خشت و چوب و سنگ کے ڈھیر

دراز دستیِ دیہاتیانِ بد انجام
خدا دکھائے نہ صورت کبھی سنائے نہ نام
کسی طرح سے سمجھ میں نہ آئے جن کا کلام
گریز پا جو نکل کر گئے لٹے وہ تمام

لٹا لباس تلک آبرو بھی ہاں کھوئی
گرہ میں کچھ بھی نہ نکلا تو نقد جاں کھوئی

بچاؤ جان کے اس جان کی محبت میں
گیا جو مضطربانہ کسی ریاست میں
تو گیر و دار سے آیا وہاں بھی آفت میں
یہاں سے اور زیادہ پھنسا مصیبت میں

جو نقد کچھ ہے تو مخبر کا قرضدار بنا
وگرنہ بے گنہی میں گناہ گار بنا

بیان سن کے یہ سالک اڑے جو میرے ہوش
بسانِ صورتِ دیوار رہ گیا خاموش
ہجوم فکر سے خون دل میں مارتا تھا جوش
کہ ناگہاں تنِ غیب سے بہ بانگ سروش

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند
چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

روئے جنت میں بھی ہم کرکے بیانِ دہلی
اس سے ظاہر ہے نہیں خلد بسانِ دہلی

اس کے مٹنے سے ہوئی عالمِ بالا کی نمود
ورنہ تھی رشکِ فلک شوکت و شانِ دہلی

کس کا پتھر کا ہے دل کس سے سنا جاتا ہے
کون ایسا ہے کہ ہو جس سے بیانِ دہلی

محشرِ غدر سے بھی مٹ نہ سکا اس کا وجود
ہے الگ عالمِ فانی سے جہانِ دہلی

ہنستے ہیں بختِ زلیخا پہ تو یوسف ہے یہ طعن
دیکھ کس رتبہ کے ہیں پیر و جوانِ دہلی

ہے خط و خال کا عالم وہی اب تک گویا
ہے اسی وقت کی نکلی ہوئی جانِ دہلی

حسرتوں کا ہے مکینوں کی عجب ہنگامہ
رہے آباد اُجڑ کر بھی مکانِ دہلی

مٹ گئے پر بھی تو ملتا نہیں دلی کا جواب
کوئی ڈھونڈے تو اسی پر ہے گمانِ دہلی

من و سلویٰ کے مزے سے ہو وہ کیونکر آگاہ
جس نے کھایا ہی نہ ہو زلہ خوانِ دہلی

ہوتے ہیں دور کے بس ڈھول سہانے واعظ
خلد میں کیا ہے نہیں ہے جو میانِ دہلی

ہم نے دیکھا ہے ملائک کو خریدار اس کا
میں نے چلتی ہوئی دیکھی ہے دکانِ دہلی

اس قدر خلخ و نوشاد کی تعریف نہ کر
ہمنشیں آ تجھے دکھلاؤں بتانِ دہلی

غالبؔ و نیرؔ و ثاقبؔ سے بنا ہے گویا
بلی ماروں کا محلہ صفحاتِ دہلی

سن کے ہر شعر پہ کیونکر نہ ہوں آنکھیں نمناک
سالکِ غمزدہ ہے مرثیہ خوانِ دہلی

ایضاً

شہر دہلی ہوا ہے کیوں خالی
کیوں مٹی یاں سے صورتِ آدم

زورِ بازارِ موت دیکھ کہ چین
ملک الموت کو نہیں ایک دم

ڈھیر کس جا نہیں ہے مُردوں کا
کس زباں پر نہیں فغاں پیہم

نہیں تِل دھرنے کی زمیں میں جگہ
مُردے کا دفن ہو بلا سے اہم

خاکِ آسودگانِ پیشیں پر
یہ نئے طور کا ہوا ہے ستم

ایک کی قبر میں گئے نو اور
تنگیٔ جا سے لڑتے ہیں باہم

قافلہ قافلہ گئے کیوں لوگ
کب ہے اتنا وسیع ملکِ عدم

نہیں جانتے مگر عدم کو یہ لوگ
اور ہے نکتہ اس میں ہے مبہم

کرۂ خاک و باد و آتش و آب
فرطِ خلقت سے ہو گئے سے تھے کم

روئے اپنی کمی پہ یہ چاروں
ہو گیا رحمِ خالقِ عالم

دے دیے اُن کو لیکے خلقت سے
کچھ عناصر جو مل رہے تھے بہم

سپہر منشی شہاب الدین خاں مرحوم دہلوی

مرزا صابر دہلوی کے شاگرد تھے۔ زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔

مٹ گیا صفحۂ عالم سے نشانِ دہلی
مثلِ عنقا ہے زبانوں پہ بیانِ دہلی

نظر آتا ہے ہر اک جا پہ نگاہوں کا ہجوم
کیوں نہ ہو گرمیِ بازارِ دُکانِ دہلی

ان سے بیجا ہے ہمیں کم سخنی کا شکوہ
کہ ہیں خاموش مصیبت زدگانِ دہلی

روز رہتے ہیں تزلزل میں یہاں کے ساکن
آفتِ جاں ہیں مگر مدعیانِ دہلی

خوب برباد کیا رشکِ گردوں نے اسے
ہے جو مشہورِ جہاں عظمت و شانِ دہلی

جی بہلتا ہے اسے سُن کے مسلمانوں کا
گویا افسانۂ جنت ہے بیانِ دہلی

اس کے بچنے کی نہیں ہے کوئی اُمید اب تک
ملک الموت کے قبضہ میں ہے جانِ دہلی

جو بلا آئی گئی پھر نہ یہاں سے پھر کر | کیا ہی دلچسپ ہے ہر ایک مکانِ دہلی
اس کے طبقے کو جو اُلٹا ہے فلک سچ بتلا | کوئی یونان کا طبقہ تھا بیانِ دہلی
ہوا اس کا جو فصیحانِ جہاں سے نہ جواب | گویا قرآں کی زباں ہے یہ زبانِ دہلی
آسماں کیا کہ زمیں بھی نہیں تھمنے دیتی | چرخ ساں پھرتے ہیں آفت زدگانِ دہلی

اس زمیں پر نہیں بسنے کی ہے اُمید سپہر
آس بھی ٹوٹ گئی مثلِ مکانِ دہلی

سوزاں حکیم محمد تقی خاں مرحوم دہلوی

طبیب حاذق تھے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ اس مسدس کے سوا اور کلام یا دیگر حالات تذکروں میں نہیں ملتے۔

ہر ایک شہر میں شور و بکا ہے دہلی کا | فغاں کہ نام و نشاں کیا مٹا ہے دہلی کا
عجیب حال یہ جس نے سُنا ہے دہلی کا | دلِ دو نیم ہے وہ ماجرا ہے دہلی کا

خطا نہ کردہ جو پامال ایک جہاں ہووے
ہماری آنکھوں سے کیونکر نہ خوں رواں ہووے

خدا نے عرش سے تا فرش جب کیا پیدا | زمیں پہ رہنے کا انساں کو جب یہ حکم ملا
جو انتخابِ جہاں تھے سو ہند میں رکھا | رہے تھے مل کے وہیں دیکھو آدم و حوّا

کسی کا نام رکھا روم اور کسی کا شام
ہے اس مقام کا ہندوستان جنت نام

جہان آباد کے ذرہ میں تھی زر افشانی | کلاہِ زر تھی گدائی پہ زر کی ارزانی

جو آتا تیرہ دروں سنگ یہاں بدخشانی — جلا وہ پاتا یہیں ہوتا لعل رمانی

ہر ایک خوبی و حسن و جمال اس میں تھا
کمال اہل کمال ور کمال اس میں تھا

بجائے زر یہاں جوہر کی تھی فراوانی — نصب تھے لعل و گہر تھا جو تختِ مرجانی
یہیں برستے تھے گوہر ز ابرِ نیسانی — زمیں پہ ٹھوکریں کھاتے تھے درِ غلطانی

یہ بدرِ نورِ ضیا رشکِ مہرِ خاور تھا
یہ بحرِ جود و سخا کانِ سیم و گوہر تھا

یہ شہر وہ تھا کہ سب جامِ جم اسے کہتے — سمجھ تھی جن کو وہ رشکِ ارم اسے کہتے
یہ شہر وہ تھا کہ بحرِ کرم اسے کہتے — بجا تھا چشمۂ فردوس ہم اسے کہتے

اسی کے لینے کا شایق ہر ایک سرور تھا
یہ شہر وہ تھا کہ سرتاجِ ہفت کشور تھا

وفورِ حسن و لطافت میں اس کا تھا شہرا — یہ کانِ علم و ہنر میں تھا ایسا ہی یکتا
کسوٹی کہتے ہیں جس کو وہ شہر دلی تھا — یہاں کے سنگ میں پارس کا تھا اثر پیدا

وطن کو چھوڑ ہر ایک سمت سے جو آتے تھے
اسی شہر سے سب انسان بن کے جاتے تھے

غریب پرور و کانِ کمال تھا یہ مقام — عدیل اس کا نہ تھا جانتے ہیں خاص و عام
بر آتی آرزو ان کی جو آتے یاں ناکام — یہاں سے نام وہ پاتے جو ہوتے تھے گمنام

سند جہاں کو تھی عالی مقام سے اس کے
یہ اعتبار تھا عالم کو نام سے اس کے

جگر ہو ٹکڑے فسانہ ہے وہ بلا اس کا
وقار جتنا بڑھا تھا گھٹا سوا اس کا
ہر ایک مکان و مکیں خاک میں ملا اس کا
ہزار حیف کہ اب نام بھی مٹا اس کا
دعائے بد کسی ایسے ہی پُر جفا کی لگی
یقین جان کہ اس کو نظر بلا کی لگی

نہ پوچھو کجروی چرخِ پُر بلا ہم سے
چھٹایا اس نے وطن اور دلربا ہم سے
یہ سب کا دُشمن جاں ہے مگر سوا ہم سے
سزا اسے بھی ملے پوچھ کر خدا ہم سے
اس آسمان پہ ہو عرش سے بلا نازل
جلا کے اس نے کیا خاک ہے ہمارا دل

ہمارے ساتھ کہاں کی اسے عداوت ہے
ہوا جو حشر ہے برپا یہی قیامت ہے
جہان ہے تہ و بالا یہ کیسی آفت ہے
یہ خوش نہووے کہ اس کی بھی آئی شامت ہے
ہمارے نالۂ سوزاں اسے جلا دیں گے
فلک کو دیکھنا ہم خاک میں ملا دیں گے

جہان آباد کو برباد کر دیا اس نے
غم و الم کو بس آباد کر دیا اس نے
جو شاد رہتے تھے ناشاد کر دیا اس نے
خوشی کے نام کو آزاد کر دیا اس نے
یہ ہے ہمیش سے دنیا میں دُشمنِ خونخوار
اسے بھی کاش ملے سامنے ہمارے دار

سمجھ میں آتا نہیں کیسی یہ بلا آئی
کہیں یہ کس سے کہو کس کی ہے یہ گمراہی
عدول حکمی کی دلیر جو فوج یہ چھائی
ہے اپنی زشتیِ اعمال کی یہ رُسوائی
بلا یہ پورب سے میرٹھ کے جو یہاں لائے

عمل ہمارے مجسّم یہ سامنے آئے

اُنھوں کے آتے ہی دہلی میں قتلِ عام ہوا | جو سرورانِ حکومت تھے ڈھونڈ کر مارا
وہ بچے پھول کی پتی سے جن کو ذبح کیا | گیا زمیں سے فلک تک یہ شور و اویلا

خدا کا خوف نہ آیا وفا کو چھوڑ دیا
ستم یہ دیکھ جفا نے جفا کو چھوڑ دیا

جو ظلم آنکھوں سے دیکھا کہا نہیں جاتا | سنا جو کانوں سے اُس کو لکھا نہیں جاتا
نشانِ نقشِ ازل تو مٹا نہیں جاتا | کرے بیان جو اُس کا سنا نہیں جاتا

ہوا نہ جاتی تھی بے اذن جن کے گلشن میں
وہ خاک چھانتے پھرتے ہیں جنگل اور بن میں

یہ سرکشی ہوئی میرٹھ کی فوج سے جس دم | نہ کارتوس کو کاٹا ہوئی تھی جو برہم
یہاں وہ آئی تو آیا تھا سب کا ناک میں دم | جو افسر اُن کے تھے پہلے کیا سر اُن کا قلم

ہوئے جو قتل وہ دیوانِ عام کے آگے
فرشتے چھوڑ زمیں آسمان کو بھاگے

یہاں کے جتنے تھے اوباش ملکے اُن کے سات | کہا بتائیں تمھیں زر کے ہاتھ آنے کی گھات
مگر یہ شرط ہی گر آئے کچھ ہمارے ہات | برائے نام نکالی یہ لوٹنے کی بات

جو اونچا گھر کوئی تکتے تو اُس پہ چڑھ جاتے
فرنگی اس میں ہیں یہ کہہ کے گھر وہ لٹواتے

وہ بے نیاز ہی دیکھی جو اُن کی کجرائی | جفا و جور و ستم کی نہ واں ادا بھائی
عذاب جب یہ انازل زمین تھرائی | پھر اُن کے ساتھ ہی دلی پہ اک بلا آئی

عتاب آوے تو اس پر وہاں مدار نہیں
گناہ کردہ و ناکردہ کا شمار نہیں

ہوئی جو عرش سے نازل بلا تو کس سے رکے
جو کام تھا وہ یہ اول تمام کر ہی چکے
کچھ اس کی وہاں نہیں پروا جو لاکھ ہوں سجدے
نزول سے پہلے جھکے سر سے اب جھکے تو جھکے

وہاں ہے کس کو مجالِ کلام و تابِ سخن
ولی ہیں خوف سے بیٹھے لگائے مہر دہن

یہ جوق جوق جو دہلی میں جمع تھے ظالم
کٹے ہزاروں نہ باقی رہا کوئی سالم
لڑے پھر اُن سے ہمیشہ جو ان کے تھے حاکم
جو اس میں بھید تھا اُس کا خدا ہی ہے عالم

پڑے جو گولے تو بے دین بھاگے اور ترسا
جب آسمان سے مینہ اُن پہ آگ کا برسا

اکڑ کے پنجوں کے بل جو زمین پر چلتے
تفنگ و تیغ کو چمکاتے ہر گھڑی ملتے
جو سیدھی بات کرے اُن سے اُس کو وہ دلتے
نشہ میں لاف وہ کرتے تو سُن کے سب جلتے

ہوئے تھے جو کہ مقابل ہیں بے سنان و سیف
دماغ جھڑ گیا اُن کا رہا نہ باقی کیف

رعایا کو ہوا دشوار شہر کا رہنا
نہ جانتے تھے کہ ہونا ہے کیا ستم سہنا
ہوئے خراب جنھوں نے نہ مانا تھا کہنا
بجائے اشک ہوا خون چشم سے بہنا

نہ تھی وہ قابلِ رحمت پڑے نہ اب پالا
جہان آباد پہ اس فوج نے ستم ڈالا

نزولِ رحم کے بدلے میں آیا ہے گا عتاب
سزا عمل کی ملی ہو گئے جو خانہ خراب

نظر اُٹھا کے جسے دیکھا تھا وہ چشم پُر آب | مٹا ہے نام و نشاں اب یہاں کا مثلِ حباب
ہے ذکر کیا جو کوئی آرزو بھی بر آوے
جو موت آئے تو وہ دیکھ اُن کو پھر جاوے

نکلنے کا تھا سکے دہلی سے یہاں نہ رہنا تھا | بلائیں سہتے نہ کچھ پُر بیوں سے کہنا تھا
نہ پاس اپنے زر و نقد تھا نہ گہنا تھا | نصیب اپنے لئے تھے ستم یہ سہنا تھا
کہ خاک چھانیں ہر اک قریہ کی پھریں در در
نہ پوچھے بات کوئی دیکھ بے زر و بے پر

کہاں وہ شوکت و حشمت کہاں وہ جاہ و وقار | کہاں وہ مکنت و رفعت وہ عظمتِ سرکار
کہاں وہ قدرت و ثروت وہ عیشِ لیل و نہار | کہاں وہ فرحت و عشرت وہ صحبتِ دلدار
بکا ہے یاس ہے حرماں ہے چشمِ پرنم ہے
فغاں ہے آہ ہے نالہ ہے جوشِ ماتم ہے

ستم کہ بادِ مخالف خزاں کو لاتی ہے | بیان کیا کروں اس کا کہ پھٹتی چھاتی ہے
جو اہلِ قلعہ تھے ثروت یہ اُن کی جاتی ہے | کہ ساتھ اُن کے یہاں سب کی شامت آتی ہے
ہمارا سینہ و دل چاک ہو گیا افسوس
یہ کیسا لاکھ کا گھر خاک ہو گیا افسوس

رہی کسی کو فراست نہ نامِ دانائی | جو سروران حکومت سے جنگ ٹھہرائی
خمار جاتا رہا ہے قضا نے پلوائی | حصول کچھ نہ ہوا جز ملال و رُسوائی
ہوئے ہیں جمع جو نا اہل و ناکارہ کمین
بلا میں ڈال کے سب کو نکل گئے بیدین

بیان کیا کروں اس کا کہ جاں ہے گھبرائی — کہ مو شگافی سوا کچھ نہیں ہے دانائی
بلا پہ آئی بلا پر اُٹھیں نہ موت آئی — جنھوں نے دہلی میں شاہی تھی نام کی پائی

نزول جب ہو بلا کا نہ کیوں زمین ہل جائے
جو چاہیے اُن کی ترقی وہ خاک میں مل جائے

تھے ایکے وز فراہم جو شاہ کے فرزند — کی عرض شہ سے کہ اقبال آپ کا ہو بلند
دعا قبول ہوئی آپ کی ملی یہ گزند — خفا گلو ہے ہمارا اجل ہے طوق کمند

ہمارے حق میں جو ارشاد تھا سو پیش آیا
کہ اپنے سامنے سب کو عدم میں بھجوایا

اُجڑ گیا چمن آرائے گلرخاں افسوس — رہا نہ گلشن وگل اور باغباں افسوس
وہ نا قدر تھا کہوں کیسا قدرداں افسوس — کہ جس کی یاد میں کرتا ہے اک جہاں افسوس

چلی ہے باد خزاں ہے خزاں کی طغیانی
خدا ہی جانے کہ آفت ہے اور کیا آنی

قدیم سے جو یہاں تھے امیر اب ہیں غریب — حوادث ایسے ہیں برپا کہ ہیں کمال عجیب
اب اُن کو بیٹھنے دیوے نہ کوئی اپنے قریب — کہ جن کے در پہ رہا کرتے تھے ہزار نقیب

نہ سمجھے کوہ بلا جو یہاں ہے ٹوٹ پڑا
یہ آسمان ستم لو یہاں ہے ٹوٹ پڑا

چھپے زمیں میں عبرت ہے جو کہ تھے انساں — مراد جن سے ہے انسان کی وہ اب ہیں کہاں
ملے ہزار جتن سے گر اُن کا نام و نشاں — سو وہ بھی ایسا کہ ہو جیسے چشمۂ حیواں

بشر کی شکل میں سیرت نہیں ملی ان کو

برائے نام ہیں کہتے ہو آدمی جن کو

کہاں وہ تاج کا مالک کہاں ہے وہ دربار   کدھر گئی دیوانِ خاص کی وہ بہار
اب اس کے دیکھے جو اُجڑے ہوئے در و دیوار   یہ دل میں آئے کہ سر پھوڑ اور چیخیں مار

ہے پارہ پارہ جگر کیسی دل لگا رہی ہے
بجائے اشک جو آنکھوں سے خون جا رہی ہے

بنا ہوا تھا جو مہتاب باغ کا گلشن   گل شگفتہ ہے عندلیب وہ نہ چمن
کہاں وہ نرگسِ شہلا نسترن نہ سمن   روا ہے اب کہیں اُس کو کہ ہے وہ دشتِ محن

چمن سے سرو کو آزاد کر نکال دیا
گلے میں قمری کے دیکھا کہ طوق ڈال دیا

صبا چمن میں اُڑا لائے ہے اپنے سر پہ خاک   جہاں تھی نرگس و لالہ نہیں خس و خاشاک
ہر ایک گل جو ہے پژمردہ با دلِ غمناک   کیا ہے گلشنِ ہستی نے اب گریباں چاک

کریں ہیں نوحہ مچا شور بلبلانِ چمن
ملے ہیں خاک میں گلچین و گلرخانِ چمن

وہ کیا ہوئے جو یہاں تھے امیر ابن امیر   تھی جن کی شوکت و عظمت ہر ایک کی توقیر
جبین عجز جھکاتے وہاں صغیر و کبیر   سمجھ کے فخر کھڑے رہتے در پہ جم غفیر

یہ کیسا پردۂ ناموس چاک چاک ہوا
ملے وہ خاک میں دل سب کا جل کے خاک ہوا

کہاں ہا وہ دماغ اُن کا اور وہ سردار   کہ جن کو بات کے کرنے سے آتی تھی عار
نظر اُٹھا کے جو دیکھیں تو ہوتا دل بریار   لبِ در اُن کو بلانا تھا کس قدر دشوار

وہ مضطر ہو کے جو باتیں کسی کے سات کریں
کرے نہ بات کوئی اُن سے جب وہ بات کریں

ہمیشہ عطر جو پوشاک میں لگاتے تھے
تھی نکہت ایسی کہ اُس سے نہ تاب لاتے تھے
بدلتے شام و سحر جوڑے اور بساتے تھے
خجل ہو گل کفِ افسوس ملتے جاتے تھے

وہ دیکھو پیرہن آلودہ خاک پھرتے ہیں
کہاں ہیں جیب گریبان چاک پھرتے ہیں

گلے میں پھولوں کا کنٹھا سدا پڑا رہتا
وہ زلف نافۂ مشک اُس سے وہ کھلا رہتا
اور عطرِ گل بھی پھر اُس پر جدا لگا رہتا
شمیمِ عطر گریباں میں دل پھنسا رہتا

اب اُس گلو میں ہے طوق رسن بجائے سمن
ہے چاک چاک گریباں ہر ایک غنچہ دہن

جو نازکی سے اُٹھائے نہ گل کو جان کے بار
رہا نہ عطر ہی باقی نہ زلفِ عنبر بار
بجز نسیمِ گل اُن کے گلے میں تھا نہ ہار
چلے ہیں سر پہ رکھے اپنے بار نصف نہار

وہ پا برہنہ ہیں کانٹے ہیں اور ہے رہِ سنگ
پڑے ہیں چھالے جنھیں بار تھا حنا کا رنگ

قدم جو رکھتے نہ تھے فرش پر پلنگ سے اُتر
جگر کے ٹکڑے ہیں دیکھ اُن کو بادلِ مضطر
برہنہ پا وہ گلی کوچوں میں پھریں در در
ستم یہ ایسے ہوئے تھے کہو بھلا کس پر

بجائے عیش شب و روز اس کا رونا ہے
اب اُن کو فرش زمیں خاک کا بچھونا ہے

وہ نازنیں کہ نزاکت بھی دیکھ گھبراوے
کہ جن کی بسترِ گل پہ سے نیند اُڑ جاوے

گمان میں جو نہو کیا خیال میں آوے | لکھا ازل کا جو تقدیر سامنے لاوے

پکڑکے زلف کیا قتل اُن کو سنگے سر
صبا کے چھونے سے ہوتے جو تھے پریشاں تر

اب اُن کا حال ہوا یسا خدا نہ دکھلائے | مصیبت ایسی کسی پر کبھی نہ اب آوے
رہائی جب کو نہ قیدِ حیات سے پاوے | صد آرزو وہ تھے کاش جان نکل جاوے

نہ دیکھی ہو کبھی آئی نہ ایسی حیرانی
فلک نے اُن کو جو دی ہو گی اب پریشانی

برہنہ پا کوئی نکلا کوئی گریباں چاک | کسی کا دیدۂ گریاں کسی کے سر پر خاک
ہر ایک نبید سالرزاں تھا با دلِ غمناک | تھی دشمنوں کی بھی ہر سمت سے یہ اُن پر تاک

قدم نہ اُٹھتا تھا جو وہ قدم اُٹھاتے تھے
ہزاروں ٹھوکریں کھاتے تھے گرتے جاتے تھے

وہ کون ہے جسے اس درد کا نہیں آزار | بشر وہ کونسا ایسا ہے جس کے دل کو قرار
طپاں ہے جان بلا نالہائے آتشبار | لگیں ہیں آہ کی وہ برچھیاں جگر ہے فگار

جو صبر دیویں تو یعقوب ار کو دیویں
ہمارے حال کو ایوب دیکھ رو دیویں

زمانہ کوچ کا بس آگیا ہے وقتِ رحیل | قیامت آنے میں ہرگز نہ اب ہی ہے دمِ مہل
جو نفخِ صور لیے ہاتھ میں ہے اسرافیل | ہو کس میں جان کہو کیا کریں گے عزرائیل

حدوثِ حشر سے پہلے ہوا اپنا کام تمام
قیامت آئی اگر بعد اپنے تو کس کام

رواں ہی اشک کا دریا نہیں مجالِ سخن
وہ قدر دان کہاں سمجھیں جو کمالِ سخن

گئے زمین میں تھا جن سے احتمالِ سخن
عبث ہر ایک سے کیجے نہ قیل و قالِ سخن

لگا کے مُہر دہن کو نہ فکر کر سوزاں
کسی سے بات نہ کیجے کہ ہی جگر سوزاں

ہزار شکر وہی آئے حاکمِ دوراں
کہ جن کے عدل سے بیکار تیغ و تیغِ زباں

غریب آن بسے پھر وطن میں ہو شاداں
خزاں میں از سرِ نو ہی بہار کا ساماں

فلک یہ عدل سدا اُن کا پائدار رکھے
قرار ایسا اُنھیں دے نہ بیقرار رکھے

ایضاً تاریخِ غدر مفسدانِ باغی

یہ ابتدائی بلا تھی جو پوربی لائے
تھی سولھویں رمضان کی جو شہر میں آئے

اخیر مصرع میں تاریخ و سال کو پائے
جو اُس کو دیکھے وہ آنکھوں سے خون بہائے

ہی جوشِ گریہ سے یہ حال چشمِ سائل کا
جو قطرہ اشک کا ٹپکے سو ہی لہو دل کا
۱۲ ھ ۷۴

شاطر۔ میر اکرام الدین مرحوم۔ دہلوی

کوئی عالم میں نہیں شہر بسانِ دہلی
ہی مٹے پر بھی سوا عرش سے شانِ دہلی

پہلے رونا تھا اُنھیں تو فلکوں کا اور اب
بن گیا اور فلک دودِ فغانِ دہلی

طعنہ کیوں دیتی ہی اے بادِ بہاری اس کو
تجھ سے بہتر ہی ابھی تک تو خزانِ دہلی

نہ تو دل کہنے میں ہی اور نہ قابو میں زباں
پوچھ مت ہم سے کہ ہم اور بیانِ دہلی

غدر کو تیغ نہ سمجھوں تو بھلا کیا سمجھوں
دل پہ آتا ہی نظر زخمِ زبانِ دہلی

اہلِ جنت سے نہ باتوں میں ملا لطف ہمیں
نہ سُنی جبکہ وہاں ہم نے زبانِ دہلی

پہلے بہتر تھا جوانوں سے ہر ایک پیر جواں
اور اب پیر سے بدتر ہیں جوانِ دہلی

چمنِ خلد بڑھانا تھا الٰہی منظور
باغِ دُنیا میں نہ رکھا جو نشانِ دہلی

دیکھنا چشمِ حقارت سے نہ اس کو شاطر
ہی مٹے پر بھی سوا عرش سے شانِ دہلی

شایق۔ آغا مرزا مرحوم۔ دھلوی

فغانِ دہلی میں ان کو مرزا داغ کا بھائی اور شاگرد لکھا ہو کسی تذکرے میں ان کے حالات نظر سے نہیں گزرے۔

بود از دیرِ فلک دشمنِ جانِ دھلی
کہ چنیں کرد بہ این شوکت و شانِ دہلی

دل بغم چشم بخوں لب بفغانِ دہلی
وائے بر خستگی خستہ دلانِ دہلی

اہلِ دہلی نہ پسندند چو خلدِ فردوس
قدسیاں آمدہ بروند مکانِ دہلی

جن و انسان و ملک چوں بدو عالم ہستند
ہمہ در حلقۂ غم ماتمیانِ دہلی

بہ یمن بود یکے حاتمِ طائی مشہور
فخرِ حاتم شدہ اکثر ہمیانِ دہلی

ہر کہ مقبول شدہ ظاہرِ او گشت خراب
یافت ہرگز نہ کسے رازِ نہانِ دہلی

رونق و بزمِ جہاں بود بہارِ دہلی
زینتِ باغِ جہاں گشت خزانِ دہلی

ماتمِ ہمنفساں شغلِ دلِ افگار را بست
واقعی اینکہ ہمیں است بیانِ دہلی

خامہ فرسائی بیہودہ نہ شاید شایق
کیست ہم پایہ کدامی ست بشانِ دہلی

شمشیر۔ میر شمشیر علی مرحوم دہلوی

کیسے کیسے ہوئے برباد مکانِ دہلی
نہ رہے ہم نہ رہا نام و نشانِ دہلی

رحم آیا نہ تجھے ای فلکِ کیں پرور
کیونکہ برباد کیئے تو نے مکانِ دہلی

ہوئیں برباد جو مشہور عمارات تھیں یاں
نام کے واسطے باقی ہے نشانِ دہلی

مومن و غالب و ذوق اور ظفر تھے بے مثل
جن کی اُردوے معلےٰ تھی زبانِ دہلی

ہفت اقلیم کے سلطان تھے اس کے مشتاق
ایسے بے مثل بنائے تھے مکانِ دہلی

مبتدی یاں کے جو تھے سارے جہاں کے اُستاد
سب وہ برباد ہوئے پیر و جوانِ دہلی

خاص بازار جو تھا قلعہ معلےٰ کے قریب
واں تھی ہر جنس سے معمور دکانِ دہلی

اب نہیں نام کو واں کوئی عمارت باقی
ایسے بے نام ہوئے سارے مکانِ دہلی

ای فلک ڈر کہ جگا دیں نہ عدم میں فتنے
خوگرِ جور ہیں سب پیر و جوانِ دہلی

آسماں چال ہی چوکا جو مٹایا اس کو
لامکاں ہو کے بڑھی عزت و شانِ دہلی

خلد میں دل کہیں گھبرائے نہ ان کا رضواں
حوریں ایسی ہیں کہاں جیسے بتانِ دہلی

جو ازل میں تھا لکھا وہ ہوا سب کو درپیش
کر نہ شمشیر بیاں اب تو فغانِ دہلی

شیفتہ۔ عظیم الدولہ سرفراز الملک محمد مصطفےٰ خاں مظفر جنگ مرحوم دہلوی

خاندان بنگش کی یادگار ۱۸۰۶ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے ۱۸۵۵ء میں حج بیت اللہ اور زیارت روضہ نبوی سے مشرف ہوئے ۱۸۶۹ء میں جبکہ زندگی کے باسٹھ سال ختم ہو چکے تھے

دہلی میں انتقال ہوا اور درگاہ حضرت نظام الدینؒ اولیا کے جوار میں دفن ہوئے ان کی ایک کلیات جو فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ ہے ۱۹۱۶ء میں کلیات شیفتہ و حسرتی کے نام سے نہایت آب و تاب کے ساتھ نظامی پریس بدایوں میں طبع ہوئی ہے۔ فارسی میں حسرتی تخلص فرماتے تھے۔

ہائے دہلی و زہے دل شدگانِ دہلی
آپ جنت میں ہیں اور دل نگرانِ دہلی

وہی جلوہ نظر آتا ہے تصور میں ہمیں
مٹ گئے پر بھی یہ باقی ہے نشانِ دہلی

کل یوم ہو فی شان کی ہے جلوہ گری
کیا ہوا گر نہ رہی شوکت و شانِ دہلی

تھیں جو انہارِ بہشتی کی حکایت نہریں
وہی نہریں ہوئیں اب اشکِ روانِ دہلی

گر نہ کہیں کہ یہ دلی ہے تو ہرگز نہ پڑے
دلی والوں کو بھی دلی پہ گمانِ دہلی

دلی اب ہے تنِ بیجاں۔ تنِ بیجاں۔ کیا خاک
جان سے جا چکے جو لوگ تھے جانِ دہلی

کس لئے پردے سے نکلے "ارم ذات عماد"
ابھی موجود ہیں دو چار مکانِ دہلی

ربع مسکوں سے زیادہ ہے بہت وسعت میں
چاندنی چوک کہ واقع ہے میانِ دہلی

صورتیں ہو گئیں معنی جسد ارواح ہوئے
بے خبر کہتے ہیں ویراں ہے جہانِ دہلی

رند بر یہاں کے کریں رشکِ ثقاہت امصار
بادشاہوں پہ کریں ناز شبانِ دہلی

دل قدح۔ بادۂ محبت۔ گل و ریحاں عرفاں
کچھ نئے رنگ کے ہیں بادہ کشانِ دہلی

پیر خوش رائے اگر ہیں تو جواں ہیں خوش شرو
عجب انداز کے ہیں پیر و جوانِ دہلی

شیفتہ اور ستایش کے نہیں ہم خواہاں
یہی بس ہے کہ کہیں "ہے یہ زبانِ دہلی"

صابر شاہزادہ مرزا قادر بخش مرحوم دہلوی

بسکہ بیداد سے ٹوٹے ہیں مکانِ دہلی
ہو رقم خطِ شکستہ سے بیانِ دہلی

لامکاں ہو گئے لوٹے سے مکانِ دہلی
بڑھ گئی عرشِ معلےٰ سے بھی شانِ دہلی

یہ وہ جا ہے کہ دکھاتی تھی سدا حشر کو راہ
چشمِ نقشِ قدمِ راہ روانِ دہلی

جس طرف دیکھیے اللہ ہی نظر آتا ہے
بڑھ گئی اور بھی ویرانی سے شانِ دہلی

موجزن اشکِ مسلسل ہیں گلی کوچوں میں
پا بزنجیر ہوئے سروِ روانِ دہلی

طالعِ خفتہ کو ہوتا ہے فسانہ۔ اُن کے
کیوں یہ کرتے ہیں فغاں غمزدگانِ دہلی

خلد تھی ان کی گلی عرشِ بریں بام اُن کا
دعویدارانِ خدائی تھے بتانِ دہلی

نرکھا چرخ نے رہنے کا وسیلہ کوئی
کیا فرشتوں کو بسائے گا میانِ دہلی

وہ گریزاں ہوئے سب اور یہ ترکش میں رہے
تھے مگر تیر و کماں پیر و جوانِ دہلی

اس کا سایہ تھا سعادت کا کبھی سرمایہ
تھا ہما سے بھی سوا زاغِ بیانِ دہلی

لوٹ سے اور بھی بازار ہوا گرم اس کا
صاف ہے صورتِ آئینہ مکانِ دہلی

مردے تو مردے ہیں زندوں میں نہیں دم باقی
عدم آباد میں بستے ہیں کسانِ دہلی

اُن کے اُٹھنے سے یہاں بیٹھنے کو جا نہ رہی
ہند میں ظلِ الٰہی تھے شہانِ دہلی

وہ ہوئے غم سے سفید اور یہ شہ کے باعث
ایک عالم میں ہیں سب پیر و جوانِ دہلی

بسکہ گلزار ہے زخموں سے تنِ ایک عالم کا
بن گئی موسمِ گل فصلِ خزانِ دہلی

اہلِ دہلی کی سیہ بختی کا غم ہے صہا ہے
کہ سیہ پوش ہیں سب ظروف[1] میانِ دہلی

صفیر دہلوی

کیا آسمان آج بد عنوان ہو گیا
عالم تمام غرقۂ طوفان ہو گیا

[1] دہلی میں ظروفِ گلی عموماً سیاہ بنتے ہیں ان کی طرف اشارہ ہے۔

یہ تہلکہ ایک حشر کا سامان ہو گیا   اس غم کا پار سینہ سے پیکان ہو گیا
دلی سا شہر ہائے رے ویران ہو گیا

یہ شہر بعد مکہ کے شرف البلاد تھا   یہ شہر جملہ شہروں میں مینو سواد تھا
ساکن ہر ایک اس کا بہشتی نژاد تھا   ہر کوئی وصلِ یار کی مانند شاد تھا
تھا باغ اب اُجڑ کے بیابان ہو گیا

ہے ہے وہ شہر جس میں نہ تھا درد و غم کا نام   رہتا تھا جس میں زہرہ جبینوں کا اژدہام
شمس و قمر بھی جس کے سلامی تھے صبح و شام   جس کا سدا تھا فصلِ سعادت سے التزام
اب موردِ نحوستِ کیوان ہو گیا

ہے یاسمیں ہی غم سے نہ کچھ زرد اور زبوں   سوسن بھی پیٹ پیٹ کے ہوتی ہے نیلگوں
لالہ کے دل پہ داغ ہے پیتا ہے اپنا خوں   اور گل کا جیب چاک تو غنچہ ہے سرنگوں
نرگس کو اس کے سوگ میں یرقان ہو گیا

اس شہر کا تو ماہ کے دل پر بھی داغ ہے   ماہی کو کب تڑپنے سے ہر دم فراغ ہے
تھا عشرتِ بہشت سے اب رشکِ راغ ہے   تھا آشیاں ہما کا وہ اب صرفِ زاغ ہے
عاشق کے دل کی طرح سے ویران ہو گیا

وہ تخت گاہِ خاص کہ عالم میں مشتہر   شاہِ فلک بھی جس کا سلامی تھا ہر سحر
وہ سلطنت کہ مرجعِ شاہانِ نامور   وہ قلعہ جو حصارِ فلک سے بلند تر
تاراج اب بعرصۂ یک آن ہو گیا

یوں آسماں کی اس کو نظر کھائے حیف ہے   مانند مالِ مفت کے لٹ جائے حیف ہے
یوں دفعتاً ورق یہ اُلٹ جائے حیف ہے   رونے کا یہ مقام ہے اور جائے حیف ہے

کیوں یہ جہاز غرقہ طوفان ہو گیا

ناموس اور ننگ کا تو تمام تھا کہاں — بے پردہ و حجاب تھیں نیکو سیر زناں
شیطاں کی طرح ٹوٹتے تھے جن پہ ایماں — وہ حال جس سے مانگے قیامت بھی الاماں

دلی سا شہر حشر کا میدان ہو گیا

جاتا رہا وہ مسجدِ جامع کا امتیاز — جسمیں کہ تھی فرشتوں کو سجدے کی حرص و آز
تھی کعبہ کی مثال. جہاں پنجگاں نماز — کیا پوچھتے ہو کیا کہیں تقدیرِ بے نیاز

اب وہ مکان صرفِ گرستان ہو گیا

یہ کیا ستم ہے چرخِ ستمگار ہائے ہائے — کیسا مٹا دیا ہے یہ گلزار ہائے ہائے
صرفِ زیاں ہے صورتِ بیمار ہائے ہائے — گر گر رہے ہیں سب در و دیوار ہائے ہائے

غم سے سحر کا چاک گریبان ہو گیا

خوبوں کے کیا ہوئے وہ خدا رنگ ٹھٹھے — پژمردہ ہو گئے یہ غنچہ ہائے! لہلہے
موقوف ایک بخت ہیں یاروں کے قہقہے — جاتے رہے **ضمیر** کے بھی اب وہ چہچہے

اب ہمصفیرِ بلبلِ نالان ہو گیا

ضمیر مرزا مصطفےٰ بیگ مرحوم دہلوی

کس کے آگے میں کروں آہ بیانِ دہلی — چڑھ گئے دار پہ سب پیر و جوانِ دہلی
پست تھی شان فلک دیکھ کے شانِ دہلی — غیرتِ خلد تھا ہر ایک مکانِ دہلی
چوک میں نہر جو واقع ہے تو چھاؤں کی نمود — مثل جنت کے رواں ہے یہ میانِ دہلی
منتخب سارے جہاں کی تھی ہر اک جنس یہاں — رشکِ بت خانۂ چینی تھی دکانِ دہلی

خاک میں مل کے یہ معلوم ہوا ہم کو ضمیر
نظرِ خصمِ فلک تھی نگرانِ دہلی

طالب نواب احمد سعید خاں مرحوم دہلوی

رئیس دہلی اور جاگیردار لوہارو تھے ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے ۱۹۲۲ء میں انتقال کیا مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ کلام غیر مطبوعہ چھوڑا۔

دلی والوں کی زباں پر ہے بیانِ دہلی
اور فلک پر ہیں ملک مرثیہ خوانِ دہلی

بارے آباد ہوا پھر کے جہانِ دہلی
بنتے جاتے ہیں جو ٹوٹے ہیں مکانِ دہلی

شہر دہلی تھا عجب رشک دہِ خلدِ بریں
ہمنشیں تجھ سے کروں خاک بیانِ دہلی

فتنۂ غدر کو ہنگامۂ محشر کہیے
نالۂ صور سے ملتی ہے فغانِ دہلی

سارے عالم میں پھرا اور سنی سب کی زباں
پر نہ طالب نے کہیں پائی زبانِ دہلی

ظاہر لالہ رام پرشاد آنجہانی۔ دہلوی

کیوں نہ آوارہ پھریں غمزدگانِ دہلی
کہ ہے عنقا کے نشیمن میں نشانِ دہلی

جھولیاں کیوں نہ بھریں دعیانِ دہلی
کہ عجب طرح کی زرخیز ہے کانِ دہلی

بارِ منت سے بھلا کس کا نہیں سر نیچا
کس کے سر پر نہیں احسانِ شہانِ دہلی

کوئی ظاہر میں نہ تھا اس کی خرابی کا سبب
اپنے اعمال ہوئے آفتِ جانِ دہلی

کس قرینے سے تھی آراستہ ہر جنس کی چیز
چمنستان تھی گویا کہ دکانِ دہلی

صبح پیری کے تھی کافور سے اس کو نسبت
گل رخسار جو رکھتے تھے جوانِ دہلی

رشکِ طوبیٰ قدِ دلجو رُخِ انور خورشید
ماہِ نو تھا خمِ ابروئے بتانِ دہلی

بند ہو جاتے ہیں شیرینیِ الفاظ سے لب
کیا زباں کھول سکیں مدعیانِ دہلی

میرے نزدیک تو جب دادِ فصاحت کی ملے
دہنِ اللہ کا ہو اور زبانِ دہلی

نظر آتی نہیں صورت کوئی آسایش کی
پنجۂ مرگ میں ہے جانِ کسانِ دہلی

اک فلک اور بنا میرے ستانے کے لیئے
جب اُٹھا دل سے مرے دودِ فغانِ دہلی

ایسی تصویر بتاں کو جو بگاڑا اے چرخ
کیا دلِ عاشقِ شیدا تھے مکانِ دہلی

گھر ادھر گاہ اُدھر پھرتے ہیں دن بھر ظاہر
بن گئے سایۂ دیوارِ مکانِ دہلی

ظفر حضرت سراج الدین بہادر شاہ مرحوم و مغفور بادشاہ دہلی

۲۰ر شعبان ۱۱۸۹ھ م ۲۴ر اکتوبر ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۲۸ر جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ م ۲۸ مئی ۱۸۳۷ء میں تخت نشیں ہوئے۔ اکتوبر ۱۸۵۷ء میں قید کرکے کلکتے بھیجے گئے۔ ۴ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو رنگون بھیج دیئے گئے۔ دو بیویاں ایک لڑکا اور ایک پوتا ان کے ساتھ تھے۔ ایک لاکھ روپیہ ماہانہ وثیقہ ملتا تھا۔ ۷ر نومبر ۱۸۶۲ء میں وہیں انتقال ہوا۔ ذوق مرحوم کے شاگرد تھے۔ ضخیم کلیات مطبوعہ ان سے یادگار رہی۔

کیا پوچھتے ہو کجرویِ چرخِ چنبری
ہے اس ستم شعار کا شیوہ ستم گری

کرتا ہے خوار تر اُنھیں جن کو ہے برتری
اس کے مزاج میں ہے یہ کیا سفلہ پروری

کھائے ہے گوشت زاغ فقط استخواں ہما
کیا منصفی ہے زاغ کہاں اور کہاں ہما

بالعکس ہیں زمانہ میں جتنے ہیں کاروبار
شیوہ کیا ہے اُلٹا زمانہ نے اختیار

ہی موسم بہار خزاں اور خزاں بہار
آئی نظر عجیب روشِ باغِ روزگار

جو نخل پُر ثمر ہیں اُٹھا سکتے سر نہیں
سرکش ہیں وہ درخت کہ جن میں ثمر نہیں

باد صبا اوڑاتی چمن میں ہی سر پہ خاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک
ملتے ہیں دمبدم کفِ افسوس برگِ تاک
کرتی ہیں بلبلیں بھی فریادِ دردناک

شاداب حیف خار ہوں گل پائمال ہوں
گلشن ہوں خار نخلِ مغیلاں نہال ہوں

نزدیک اپنے آپ کو جو کھینچتے ہیں دور
ورنہ جو باصفا ہیں خردمند ذی شعور
دکھیا تو صاف فہم میں اُن کے ہی کچھ قصور
کیا دخل اُن کو آوے کبھی نخوت و غرور

رکھتے غبارِ کینہ سے وہ سینہ صاف ہیں
ہر نیک و بد سے صورتِ آئینہ صاف ہیں

جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں
کوئی بلا ہی خانۂ زنداں یہ آسماں
ہو وے گا سر پہ چرخ بھی جاویں گے ہم جہاں
چھٹنا محال اُس سے ہی جب تک ہی تن میں جاں

جو آگیا ہی اس محلِ تیرہ رنگ میں
قیدِ حیات سے ہی وہ قیدِ فرنگ میں

یہ گنبدِ فلک ہی عجب طرح کا قفس
جنبش ہو ایک پر کو تو پر ٹوٹ جائیں دس
طاقت نہیں ہی نالہ کی بھی جس میں یک نفس
رہ جائے دل کی دل میں نہ کس طرح سے ہوس

کیا طائرِ اُمید کی پرواز کر سکے
حبس میں نہ اتنا دم ہو کہ پر باز کر سکے

کیا کیا جہاں میں ہو گئے شاہانِ ذی کرم
کس کس طرح کے رکھتے تھے ساتھ اپنے وہ حشم
آخر گئے جہان سے تنہا سوئے عدم
دارا کہاں کہاں ہے سکندر کہاں ہے جم

کوئی نہ یہاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے
کچھ اے ظفر رہے تو نکوئی یہاں رہے

ظہیر سید ظہور الدین مرحوم دہلوی

اصلاح الدولہ مرصع رقم خان بہادر سید جلال الدین خوش نویس استاد ابوظفر بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے صاحبزادے تھے۔ راقم الدولہ کا خطاب تھا۔ ۱۸۵۶ء کے بعد کچھ عرصہ تک اخبار جلوۂ طور کی ایڈیٹری کی ۴ سال تک مہاراجہ الور کے یہاں رہے اس کے بعد ۱۹ سال تک ریاست جے پور میں پولیس کی ملازمت پر ممتاز رہے ۱۶ برس نواب احمد علی خاں رونق کی عزت افزائی سے ریاست ٹونک میں وظیفہ خوار رہے۔ آخر عمر میں حیدرآباد گئے۔ مگر سوا مہاراجہ کشن پرشاد کی مقرر کردہ رقم یعنی چالیس روپے کے یا بعض دیگر عمائدین کی مالی اعانت کے پائے گاہ آصفی سے فیضیاب ہونے کی عزت نصیب نہ ہو سکی اور باوجود شرف باریابی کے آٹھ مہینے کی امیدواری کے بعد حیدرآباد میں ۱۴ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء انتقال ہوا۔ دائرہ میر میں آپ کا مزار ہے۔

فرشتہ مسکن و جنت نشان تھی دہلی
زمیں کے پردے میں اک آسمان تھی دہلی
جہاں میں ایک عجائب مکان تھی دہلی
غرضکہ اہل بصیرت کی جان تھی دہلی

یہ وہ جگہ تھی زمیں جس کی زر اُگلتی تھی
یہ خاک وہ تھی کہ اکسیر ہاتھ ملتی تھی

سوادِ ہند میں عرش احتشام تھی دہلی
بہ ایضِ مردمکِ خاص و عام تھی دہلی

زمیں پہ چرخ کی قایم مقام تھی دہلی
جب آیا عہدِ جوانی تمام تھی دہلی
فغاں کہ جس کو ملائک نے انتخاب کیا
ستم ہے اس کو زمانہ نے یوں خراب کیا

یہ شہر وہ تھا کہ غنچہ تھا حسن والوں کا
یہ شہر وہ تھا کہ مجمع تھا خوش جمالوں کا
یہ شہر وہ تھا کہ تختہ تھا نونہالوں کا
یہ شہر وہ تھا کہ مرجع تھا باکمالوں کا
یہ وہ مکاں تھا مکیں جسکے قیصر و جم تھے
یہ خطہ وہ تھا گدا جس کے فخرِ حاتم تھے

جہاں آباد لقب تھا نہ شاعران کے لئے
یہ درجے اس کے لئے تھے نہ آسماں کے لئے
جہاں کا لفظ بنا تھا اسی مکاں کے لئے
کہ اس سے کام زمانہ نے دو جہاں کے لئے
فلک سے رتبہ میں رتبہ دو چند تھا اس کا
مقامِ عرش سے پایہ بلند تھا اس کا

نقوشِ پیکرِ ارژنگ سے تھے در و دیوار
مکاں مکاں سے ہویدا تھا جوشِ فصلِ بہار
نگار خانۂ چینی تھے کوچہ و بازار
بنا محلہ محلہ تھا غیرتِ گلزار
فلک صفائے عمارت پہ زہر کھاتا تھا
چمک سے ذروں کی خورشید تھرتھراتا تھا

دلِ جہان تھا دلی سے مدعا ہی ہے
کہ دل کو بولتے ہیں خانہ خدا ہی ہے
نہ سمجھے دل میں تلنگانِ پُر جفا ہی ہے
خدا کے گھر کو بگاڑا ستم کیا ہی ہے
نہیں جہان میں واللہ اس جفا کی پناہ
جو انتقام ہو اس کا تو بس خدا کی پناہ

یہ وہ الم ہے کہ اس غم سے سب ہلاک ہوئے — لگا کے چرخ سے بے چین تا سماک ہوئے
ہلاک گور میں آسودگانِ خاک ہوئے — کفن بھی ساتھ گریباں کے چاک چاک ہوئے
نہ روزِ حشر سے کم تھی عذاب کی صورت
خدا دکھائے نہ اس انقلاب کی صورت

نہ غم سے دیدۂ نرگس میں اشکِ شبنم ہے — دُرِ سرشک سے چشمِ صدف بھی پُر نم ہے
چٹکنا غنچہ کا گلشن میں نالہ و غم ہے — تمام خانۂ گیتی سرائے ماتم ہے
جو دل خراش ہے شیون سے نغمہ بلبل کا
جو پُرزے پُرزے گریباں ہے باغ میں گل کا

جو رشکِ دیدۂ نرگس تھی چشمِ فتانی — ہوئی ہے گریہ خونیں سے لعلِ رُمانی
گھڑی گھڑی ہے فزوں آنسوؤں کی طغیانی — غرض کہ کشتیٔ اہلِ جہاں ہے طوفانی
نہ ناخدا ہے نہ ملاح نہ کنارا ہے
خدا کی ذات کا اس بحر میں سہارا ہے

گلی گلی سے ہے آتی صدائے واویلا — زمیں زمیں سے ہے اُٹھتی نوائے واویلا
دُکاں دکاں سے ہے گھر گھر سے حشر ہے پیدا — مکاں مکاں سے اُٹھا غلغلہ ہے شیون کا
چہار سمت رواجِ ستم پرستی ہے
فلک سے تازہ بلا پر بلا برستی ہے

زمیں زمین کے درپے ہے خاک اُڑانے کو — مکاں مکان کے دشمن ہے کاٹ کھانے کو
رہی نہ جائے زمانہ کے سر اُٹھانے کو — ٹھکانے ڈھونڈھتے فتنہ ہیں بیٹھ جانے کو
گھروں کو دیکھ پکڑنے لگے ہیں گھر عبرت

بنے ہیں روزنِ دیوار دیدۂ حسرت

ہوئی جو شام تو شامت دنوں کی شامت ہے — نمودِ صبح قیامت پر اک قیامت ہے
بلا بلا پہ مصیبت پہ اک مصیبت ہے — گھڑی گھڑی ہے غضب لحظہ لحظہ آفت ہے

ترے ستم سے کہاں بچ کے پُرجفا جائیں
زمین شق ہو تو اب چرخ ہم سما جائیں

لباس ہے جو بدن پر اجل کا ساماں ہے — کہ آج گل سرو ساماں بھی دشمنِ جاں ہے
جو پُرزے پُرزے سلاسل کی شکلِ داماں ہے — تو بند بند ہیں طوقِ گلو گریباں ہے

بہارِ لالہ و گل اشکِ خوں دکھاتے ہیں
بجائے خندۂ لب زخم مسکراتے ہیں

جو ہاتھ عقدہ کشا تھے وہ بستہ کار ہوئے — جو قد کہ رشکِ صنوبر تھے وہ نزار ہوئے
جو پاؤں غیرتِ گل تھے وہ خار خار ہوئے — حنائی تلوے دلوں کی طرح فگار ہوئے

جو سینے گلشنِ خوبی تھے داغ داغ ہوئے
جو دل کہ خانۂ عشرت تھے بے چراغ ہوئے

نگاہ صورتِ تصویر رہ گئی حیراں — ہر ایک جسم بنا شکلِ قالبِ بے جاں
چھٹے یگانوں کے ہمراہ ہوش و تابِ تواں — برنگِ طائرِ پر بستہ اُڑ گئے اوساں

مثالِ آئینہ ہر ایک چشم حیراں تھی
دلوں کی طرح سے جو زلف تھی پریشاں تھی

ہر ایک رونقِ بزمِ جہان قتل ہوا — ہر ایک قبیلہ و ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک طوطیِ شیریں زبان قتل ہوا — ہر ایک بلبلِ خوش بیان قتل ہوا

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

نکلنا شہر سے خلقت کا بے سروساماں
وہ جانا پردہ نشینوں کا با سرِ عریاں
وہ چاک چاک گریباں لگا کے تا داماں
وہ دار و گیرِ سپاہِ بغیٔ بے ایماں

دراز دستِ تظلم ستم شعاروں کا
فلک کو پاس سے تکنا جفا کے ماروں کا

نکلتے شہر سے ہیں پر نکل نہیں سکتے
کروڑ شکل کو بدلیں بدل نہیں سکتے
ہزار چال سے چلتے ہیں چل نہیں سکتے
قدم قدم پہ ہے لغزش سنبھل نہیں سکتے

کمندِ موت نے کیا بند بند جکڑے ہیں
زمین شہر نے ایک ایک کے پاؤں پکڑے ہیں

وہ دھوپ اور وہ ریگِ تپاں وہ گرم ہوا
وہ کینہ دوزیِ غارت گرانِ بے پروا
وہ فوج فوج ہر ایک سو سے نرغۂ اعدا
اور اُس پہ ظلم گنواروں کا اور واویلا

جو ہم سے سنتے ہیں اُس انقلاب کی باتیں
تو لوگ کہتے ہیں کرتے ہو خواب کی باتیں

وہ گل سے چہرے حرارت سے تمتمائے ہوئے
لبوں پہ آہ جگر میں الم سمائے ہوئے
وہ گورے گورے بدن خاک میں ملائے ہوئے
جفا کی تیغ سے سب زخم دل پہ کھائے ہوئے

وہ داغِ مرگِ عزیزاں وہ دشت پیمائی
وہ ریگ خارِ مغیلاں وہ آبلہ پائی

گلوں سے جسموں پہ اک مردنی سی چھائی تھی
وہ مہ سے چہروں پہ گویا چھٹی ہوائی تھی

غضب وہ پردہ نشینوں کی بے ردائی تھی ۔ غرضکہ آنے سے پہلے قیامت آئی تھی
بیان کیجے نصیبوں کی کیا برائی کا
وہ دشت اور وہ پھرنا برہنہ پائی کا

جہاں کی تشنۂ خوں تیغ آبدار ہوئی ۔ سنانِ نیزہ ہر اک سینہ سے دوچار ہوئی
رسن ہر ایک بشر کے گلے کی ہار ہوئی ۔ ہر ایک سمت سے فریادِ گیرودار ہوئی
ہر ایک دشتِ قضا میں کشاں کشاں پہونچا
جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہونچا

نہالِ گلشنِ اقبال پائمال ہوئے ۔ گلِ ریاضِ خلافت لہو میں لال ہوئے
یہ کیا زوال ہوئے اور کیا کمال ہوئے ۔ کمال کو بھی نہ پہونچے تھے جو زوال ہوئے
جو عطرِ گل کا تھے ملتے ملے وہ مٹی میں
جو فرشِ گل پہ تھے چلتے ملے وہ مٹی میں

کہاں وہ خسروِ عالی نظر بہادر شاہ ۔ کہاں وہ سرورِ نیکو سیر بہادر شاہ
کہاں وہ بادشہِ دادگر بہادر شاہ ۔ کہاں وہ داورِ والا گہر بہادر شاہ
کہاں سے باغیِ بے دین آ گئے ہی ہی
کہ نام اُس کا جہاں سے مٹا گئے ہی ہی

جہاں میں جتنے تھے اوباش و رندِ نافرجام ۔ قمار بازو چغل خور و بدمعاش تمام
ہوئے شریکِ سپاہِ شریر و بدانجام ۔ کیا تمام شریفوں کے نام کو بدنام
دو چند آتشِ فتنہ کو سر بلند کیا
کیا وہ کام کہ عالم کو دردمند کیا

شریر و مغوی و نا اہل سر اُٹھانے لگے
کہ گمرہوں کو رہِ گمرہی دکھانے لگے
چھپے ہوؤں کا سُراغ و نشان بتانے لگے
پکڑ پکڑ کے ستمگار خوں بہانے لگے

اُٹھائی گیرے اُچکے گھروں سے دھر بھاگے
جو گٹھ کٹے تھے وہ گٹھڑی لپیٹ کے گھر بھاگے

بدی کے تخم شقی کشتِ دل میں بونے لگے
کہ بے گناہ زن و بچہ قتل ہونے لگے
جو اہل درد تھے رو رو کے جان کھونے لگے
مسیح و خضر بھی منہ ڈھانپ ڈھانپ رونے لگے

ستونِ خانۂ نصفت گرا دیے یکسر
چراغِ بزمِ عدالت بجھا دیے یکسر

نہ دیندار تھا کوئی نہ دینداری تھی
ستم پرستی و جور و جفا شعاری تھی
یہ پاسداریِ ملت تو مستعاری تھی
پر اس کے پردے میں فکرِ حرام کاری تھی

غرض کہ دین کو سمجھے تھے وہ ستمگاری
نمک حرامی و محسن کشی تھی دینداری

برائے نام ستمگار دیندار بنے
جو دیندار بنے تو ستم شعار بنے
ستم شعار بنے جب تو ذی وقار بنے
جو ذی وقار بنے تو حرام کار بنے

کیا وہ ظلم کہ سر پر جہاں اُٹھا مارا
خدا پرست نہ تھا کیا کوئی خدا مارا

یہ کیسی آتشِ فتنہ لگا گئے ظالم
جہاں میں ایک قیامت مچا گئے ظالم
غرض کہ نامِ خلافت اُٹھا گئے ظالم
سبھوں کو مٹنے سے پہلے مٹا گئے ظالم

کسی پہ قہرِ خدا کا نہ آفت آئی تھی

یہ خاندانِ تمر پر قیامت آئی تھی

ہزار شکر کہ دورانِ دورِ تو پر ہے
وہ آسمانِ کرم کا مہِ منور ہے
زمانہ عہد میں اُس کے ترقیوں پر ہے
سخی و سرور و ذی جاہ و داد گستر ہے

اگر نہیں تو نہ ہو بندگی و خاوندی
اُسے درست تو ہے نسبتِ خداوندی

ظہیر بیہدہ تا چند خامہ فرسائی
عبث عبث یہ تکا پو و آبلہ پائی
خیالِ ہرزہ درائی و بادہ پیمائی
نہیں پسند نہیں تیری نغمہ آرائی

زباں کو بند کر اور منہ سے کچھ نکال نہ بات
مثل سُنی بھی ہے تو نے گرشنہ را صلوات

الیضاً

بل بے دہلی و زہے شوکت و شانِ دہلی
لامکاں بن گیا ایک ایک مکانِ دہلی

مل گئی خاک میں سب شوکت و شانِ دہلی
نہ رہا نام کو بھی نام و نشانِ دہلی

اے فلک اپنے گریباں میں منہ ڈال ذرا
ہائے یہ ظلم و ستم اور کسانِ دہلی

وہ قیامت ہیں فرشتوں کو لٹا دیتے ہیں
شوخ و بدمست فسوں کار بتانِ دہلی

نام کوثر کا نہ لو حضرتِ واعظ دیکھو
چوس جائیں نہ کہیں دُرد کشانِ دہلی

زمزمے بھول گئے نغمہ طرازانِ چمن
ہے ہر ایک نوحہ گر و مرثیہ خوانِ دہلی

رہ گئے کہنے کو کچھ کچھ ہیں فسانے باقی
اب نہ دہلی ہی رہی اور نہ زبانِ دہلی

فلکِ پیر نے مٹی میں ملایا سب کو
پھرتے ہیں خاک بسر پیر و جوانِ دہلی

ہیں نئے ڈھنگ نئے رنگ نئی گفت و شنید
ایک عالم سے نرالا ہی جہانِ دہلی

دلربا مہر لقا ماہ جبیں دشمنِ دیں
کیا قیامت ہیں طرحدار بتانِ دہلی

ایک سے ایک طرحدار نظر آتا ہی
عالم آشوب ہیں یہ کج کلہانِ دہلی

چرخ بدبیں یہ غضب ہی نہ انھیں دیکھ سکا
چند اشخاص تھے باقی جو نشانِ دہلی

کیوں نہ پامال ہو مردہ ہی بدستِ زندہ
جسم دوزخ میں ہی فردوس میں جانِ دہلی

خوش متاعِ سرِ بازار ہی ارزِ بازار
جوہرِ فرد ہی کل جنسِ دُکانِ دہلی

بولتے ہیں جسے اُردوئے معلیٰ احباب
ایہا الناس ہی وہ خاص زبانِ دہلی

رات دن گریہ ہی اور سنگ ہی اور سینہ ہی
اور ظہیرِ جگر افگار و بیانِ دہلی

عابد۔ سید حسین علی خاں مرحوم۔ دہلوی

سالک دہلوی کے شاگرد تھے۔

ہم نے مانا کہ ملی خاک میں شانِ دہلی
ڈھونڈیئے اب بھی کوئی شہر بسانِ دہلی

فاقہ مستی اسے کہتے ہیں کہ غارت ہو کر
پھر اسی رنگ میں ہیں پیر و جوانِ دہلی

کرتے ہیں لوگ جو دلی کے ارم کی باتیں
حوریں سنتی ہیں بصد شوق زبانِ دہلی

خونِ دل پیتے ہیں اور شکرِ خدا کرتے ہیں
یوں بسر کرتے ہیں اب بادہ کشانِ دہلی

جنسِ حسرت کے سوا کچھ نہ رہا اب باقی
لٹ گئی غدر میں افسوس دُکانِ دہلی

غالبؔ و شیفتہؔ و نیرؔ و سالکؔ ثاقبؔ
جسم دہلی ہی تو یہ لوگ ہیں جانِ دہلی

توبہ کی عشق سے کب حضرتِ عابدؔ تم نے
سر ہے توبہ شکن جبکہ بتانِ دہلی

عاصی۔ نواب غلام حسین خاں مرحوم دہلوی

جنتی لوگوں سے سُن سُن کے بیانِ دہلی / حوریاں کرتی ہیں جنت پہ گمانِ دہلی
عرش تک پہونچ گئے غمزدگانِ دہلی / عرش سے فرش تلک ہے جو فغانِ دہلی
غور کی جا ہے جو دل میں کوئی انصاف کرے / میرؔ اور دردؔ کی ہے صاف زبانِ دہلی
جبرِ حاکم سے جو نکلے تھے سبھی شہر کے لوگ / پا پیادہ تھے مگر تھے نگرانِ دہلی
دلی سے جو کہ نہ رکھتے تھے قدم باہر کو / دربدر وہ ہی ہیں نواب و خانِ دہلی
منہدم چرخ نہ اس شہر کو کیونکر کرتا / ہفت اقلیم کی تھا جان جہانِ دہلی

عاقل نواب رضا علی خاں مرحوم دہلوی

کیا کروں کس سے کروں آہ بیانِ دہلی / جان بن کر گئے جو لوگ تھے جانِ دہلی
جن کا مذکور سُنے سے بھی غش آجاتا تھا / کیا ہوئے ہائے خدایا وہ بتانِ دہلی
دیکھ لیں گے ارم خلد کو بھی آخر ہم / شہر تو کوئی نہیں دیکھا بشانِ دہلی
باعثِ شان تھے جو لوگ سو وہ ہی نہ رہے / اب ہی کیا ہے جو تو دیکھے ہے نشانِ دہلی

حضرتِ دہلی کے باشندے ہیں جن سے عاقل
گلشنِ خلد پہ رکھتے ہیں گمانِ دہلی

عباس۔ میر عباس مرحوم دہلوی

نقشۂ خلد تھا گویا یہ مکانِ دہلی / نہ مٹا ہے نہ مٹے نام و نشانِ دہلی

کیا ہی برباد ہوا باغِ جہانِ دہلی — چشمِ حسرت سے ہی نرگس نگرانِ دہلی
اہلِ دہلی کو توحب الوطنی نے مارا — لیئے دے دے کے درم داغِ زبانِ دہلی
چشمِ بدبیں کی نظر کرگئی کام آخرِ کار — ایک مدت سے فلک تھا نگرانِ دہلی
میکدے جتنے تھے اس شہر کے برباد ہوئے — خونِ دل کیوں نہ پئیں بادہ کشانِ دہلی
کچھ نہ ہاتھ آیا۔ مگر ایک غمِ بے وطنی — لے گیا دہلی سے ہر پیر و جوانِ دہلی
اور کیا اس سے فلک قہر زیادہ کرتا — کہ ہوا پردہ درِ حسنِ بتانِ دہلی
مثلِ دہلی کے کہیں نقشہ نہ دیکھا ہم نے — ہی مگر روضۂ رضواں پہ گمانِ دہلی

عزیز راجہ یوسف علی خاں مرحوم دہلوی

کیجیے ای ہمنفسو خاک بیانِ دہلی — کہ فقط نام کو باقی ہی نشانِ دہلی
آنکلتے ہیں۔ سلامت رہے ملکِ پنجاب — نازمینانِ پری چہرہ میانِ دہلی
اس قدر نازش بیجا نکر ای فصلِ بہار — تجھ سے اس وقت بھی بہتر ہی خزانِ دہلی
غم سے ساکت ہیں جو باتیں نہیں کرتے سب سے — ورنہ کیا بن گئے پتھر کے بتانِ دہلی
ختم یہ بات ہی اس شہر پہ ہم میں منصف — صاف شفاف عموماً ہی زبانِ دہلی
شیفتہ ہی یہ جواں تم پہ کہے اس گل سے — کوئی اتنا بھی نہیں دوست میانِ دہلی
قبرِ عشاق پہ استادہ ہیں کھولے ہوئے بال — نخلِ ماتم ہی ہر ایک سروِ روانِ دہلی
جامِ مل موسمِ گل نغمہ و دیوانِ خاص — ابرِ دربار ہوا اور بحرِ روانِ دہلی
سو برس اس طرف ای وحشتِ ہر قصرِ خراب — رشکِ فردوس تھا ہر ایک مکانِ دہلی
کی تھی اجداد نے گلگشت بصد جاہ و حشم — ہم کو تقدیر نے دکھلائی خزانِ دہلی

دل کی تڑپن ہے زبس آفتِ جانِ مضطر
لے لے اس کو کوئی اب آفتِ بر

یوں تو اللہ کی قدرت کا ہے جلوہ ہر جا
پر جنھیں کہتے ہیں بت وہ ہیں بتانِ دہلی

نشۂ ہر چند ہرن ہے پہ غزل کیا لکھئے
جائے انصاف ہے اے بادہ کشانِ دہلی

سنتے ہیں گردشِ افلاک نے غصہ جو کیا
جا بسے خلد میں سب حور وشانِ دہلی

یہ بھی تاثیر ہے ایک دورِ قمر کی ورنہ
ہم کہاں اور کہاں ماہ وشانِ دہلی

کیا بیاں کیجے اے کوچۂ جاناں تجھ سے
کوئی آباد نہ تھا شہر بشانِ دہلی

للہ الحمد کہ حکام کو ہے خلق پہ رحم
ورنہ رہتا نہ کہیں نام و نشانِ دہلی

ہو چکی سمع خراشی بہت اب ہو خاموش
اے عزیز اب نہیں بہتر ہے بیانِ دہلی

عزیز مرزا یوسف علی خاں مرحوم دہلوی

جنتی دیکھ کے کہتے ہیں خزانِ دہلی
ہے بہارِ چمنِ خلد از آنِ دہلی

دہلی ایک سیف مفصل ہے کہ ہے شہر پناہ
حفظِ دہلی کے لیے طرفہ میانِ دہلی

یاں نہ ذکرِ ملکوت اور نہ بیانِ لاہوت
اور ہی کچھ ہے نگاہوں میں جہانِ دہلی

اس میں کچھ تھا کہ نہ تھا لیک بھرم تھا کتنا
غدر نے کھول دیا رازِ نہانِ دہلی

عقل چکرائے گی کہتا ہوں سن اے پیرِ فلک
بھڑ گیا تجھ سے اگر کوئی جوانِ دہلی

فرض دہلی کو اگر کیجئے جنت ہے بجا
کہ ہے یاں نہرِ رواں کاہکشانِ دہلی

پے بہ پے فاقہ ہے ہر روز تو روزہ کیسا
دیکھنا چاہیئے حالِ رمضانِ دہلی

بادہ جز خونِ جگر اور نہ ساقی جز رنج
نہ کوئی میکدہ نہ پیرِ مغانِ دہلی

نہر کا شہر میں کہتے تھے جسے زور اور شور
اب سمجھتے ہیں اُسے شورِ فغانِ دہلی

جو طلائی رُخِ خورشید پہ ہنستے تھے سدا
مل گئے خاک میں وہ سیمبرانِ دہلی

اس احاطہ میں نہیں زینتِ آبادیِ خلق
جسم بیجاں ہے یہ گویا نہیں جانِ دہلی

حیف صد حیف کہ جو لوگ ستایشگر تھے
اب وہی لوگ ہوئے مرثیہ خوانِ دہلی

لال ڈگی کہ بڑھی جس کے سبب رونقِ شہر
اب ہے بے نور وہ چشمِ نگرانِ دہلی

بند ایسے ہیں درِ شہر کہ کھلتے ہی نہیں
کہیے کیونکر نہ اُنھیں گوشِ گرانِ دہلی

خاص بازار نہیں چوک نہیں قلعہ نہیں
کیوں ہے اس شہر پہ خلقت کو گمانِ دہلی

چاندنی چوک کا میداں کہ پر از نعمت تھا
خاک اُس میں نہیں خالی ہے وہ جانِ دہلی

کیوں عزیز اب وہ کہاں قدرِ متاعِ خوبی
خاک آباد ہے دُنیا میں مکانِ دہلی

عیش حکیم آغا جان مرحوم دہلوی

خاندانی اور بادشاہی طبیب تھے۔ شیریں کلام اور خندہ پیشانی تھے۔ میاں ہدہد کو پال کر انھوں نے سب سے بگاڑ لی۔ کیونکہ وہ اُستادوں پر حملے کرنے لگے تھے۔ انھوں نے خود بھی مرزا غالب کے خلاف اجمیری دروازہ کے مشاعرہ میں ایک قطعہ پڑھا تھا جس کا آخر مصرعہ یہ تھا ع مگر ان کا لکھا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے۔

عجیب طرح کی باغ و بہار تھی دہلی
جہاں میں غیرتِ صد لالہ زار تھی دہلی

ریاضِ قدرتِ پروردگار تھی دہلی
غرض گلِ چمنِ روزگار تھی دہلی

وہ وہ تھی ابرِ گہر بار جس کو کہتے تھے
وہ وہ تھی گلشنِ بے خار جس کو کہتے تھے

بیان اس کے کروں لطف کیا میں نامِ خدا
وہ قطعہ روئے زمیں پر بڑا معظم تھا
کہیں اگر اُسے فردوس ننگ ہے اُس کا
نسیمِ خار سے بہتر تھی واں کی آب و ہوا

مشامِ جان کو بس فرحت اُس سے آتی تھی
ہر اک بشر کی مزا روح اُس سے پاتی تھی

مریضِ غم کے لیئے خانۂ شفا تھی وہ
جہاں میں دردِ دل و جان کی دوا تھی وہ
جو خاک بھی تھی وہاں کی تو کیمیا تھی وہ
بھلا میں کیا کہوں تم سے کہ چیز کیا تھی وہ

زمیں وہاں کی شرف آسماں پہ رکھتی تھی
فلک کی آنکھ بھی حسرت سے اس کو تکتی تھی

عجیب طرح کے تھے اُس کے کوچہ و بازار
ہنسے تھا آئینہ پر اُس کا ہر در و دیوار
اور اُس صفائی پہ تھا ایسا لطفِ نقش و نگار
بعینہ جیسے کہ آئینہ میں کھلے گلزار

لگا رہے وہاں اہلِ نظر کا دیدۂ دل
نہ ہووے اور طرف دیکھ کر اُسے مائل

عمارتیں تھیں وہاں کیسی کیسی شانوں کی
بیان کیجیئے کیا خوبی اُن مکانوں کی
تھی اہلِ دیدہ کو وہ فرح بخش جانوں کی
اُنھیں تھی دیکھ کے چرخ عقل آسمانوں کی

زمیں بھی تھی تو وہاں کی اس آب و تاب پہ تھی
کہ جس کے ذرہ کو بھی چشمک آفتاب پہ تھی

ہر ایک ذرہ وہاں کا تھا رشکِ صد خورشید
وہ جائے اہلِ نظر کے لیئے تھی قابلِ دید

جو عالم اُس کا تھا وہ تو نہ دیدہ ہے نہ شنید
جہاں میں قفلِ درِ آرزو کی تھی وہ کلید

ہر ایک طرح کا واں انبساط حاصل تھا
وہ طبقہ باعثِ آرامِ دیدۂ دل تھا

وہ کیا جگہ تھی طلسمات کا سا عالم تھا
مدام فصلِ بہاری کا واں تو موسم تھا
بھرا ہوا وہ خوشی سے مکان ہر دم تھا
نہ دل تھا ایسا کوئی واں کہ جو نہ خرم تھا

ہر ایک فردِ بشر کو خوشی سے کام تھا واں
نجانتا کوئی زنہار غم کا نام تھا واں

ہوا وہاں کی تھی بس مشکبار عنبر بیز
ہر ایک دل کو تھی فرحت فزا طرب انگیز
ہر ایک موج تھی اس کی خوشی سے واں لبریز
تھی جان و دل کے لیے اُس کی نکہت عشرت خیز

لطافت ایسی تھی واں کی ہوا میں نامِ خدا
کہ جس کے لطف کو کہتے تھے دیکھ صلِّ علےٰ

بسانِ آئینہ اس سوچ میں میں حیراں ہوں
کہ اُس مکان کو تشبیہ دوں تو کس سے دوں
خلافِ ادب کے ہے باغِ جناں جو اس کو کہوں
عجیب قدرتِ حق سے تھی وہ جگہ موزوں

کہ جس پہ روضۂ رضواں کو رشک آتا تھا
اور اُس کو خلدِ بریں دیکھ خار کھاتا تھا

وہاں تھا مجمعِ اہلِ کمال و اہلِ ہنر
وحیدِ عصر تھا واں کا ہر ایک فردِ بشر
رکھے تھا ہمتِ عالی ہر اک بلند اختر
کسی کو فیض ہو تھا اُن کو یہ ہی مدِ نظر

ہر ایک طرح کا وہاں فیض اُن سے جاری تھا
ہر ایک شخص پہ القصہ فضلِ باری تھا

وحید عصر تھے جو اہل علم و فضل و کمال   جہاں میں دولت جوہر سے تھے وہ مالا مال
ہر ایک عقدہ کو ہر ناخن ان کا تھا حلاّل   اور اُن کمالوں کے تھے ساتھ صاحب اقبال
زمیں کی سطح پہ فیض اُن سے اک جہاں کو تھا
زمیں پہ ان کے سبب رشک آسماں کو تھا

زبان ویسی ہی اہل زبان ویسے ہی   مکین ویسے ہی تھے اور مکان ویسے ہی
فصیح ویسے ہی تھے خوش بیان ویسے ہی   خدا کے فضل سے ذی عز و شان ویسے ہی
ہر ایک طرح کا صاحب کمال تھا اُس میں
ہر ایک صاحب حسن و جمال تھا اُس میں

ہر ایک چیز میں اُس شہر کی لطافت تھی   اور اہل شہر کی ہر وضع میں شرافت تھی
طبیعتوں میں نفاست تھی اور لطافت تھی   ہر اک سخن میں لطیفہ تھا اور ظرافت تھی
غرض وہاں کا تھا ہر خاص و عام ویسا ہی
جہان میں تھا وہ خطہ تمام ویسا ہی

شب برات کی مانند واں کی تھی ہر رات   ہر ایک روز مشابہ تھا روز عید کے ساتھ
ہر ایک شخص تھا واں نیک ذات نیک صفات   اب ہوگئی وہ جگہ ایسی مورد آفات
کہ اُس کا نام بھی لینے سے خوف آتا ہے
خیال بھی وہاں جانے سے منھ چھپاتا ہے

وہ بارگاہ کہ تھا جس کا عتبہ بوس فلک   طواف کرتے تھے جس گھر کا مہر و ماہ تلک
جہاں میں اس کی تھی عظمت سما سے تا بسمک   پہونچنا حد تلک اس کی تھا فخر حور و ملک
تباہی اُن کی سُنا قابل بیان نہیں

کہوں تو کیونکہ کہوں طاقتِ زبان نہیں

فلک نے ان کے وہ آپس میں تفرقے ڈالے
دل و جگر پہ پڑے پڑتے غم کے ہیں بھالے
پھنسے ہیں اُن کے سب آفت میں بوڑھے و بالے
اور اُن کو اُس پہ بھی جینے کے ہیں ٹپے لالے

خبر نہ جان کو دل کی نہ دل کو جان کی ہے
اور اُس پہ ویسے ہی چھیڑ اب تک آسمان کی ہے

وہاں پہ جتنے ہوئے ذوالاقتدار تھے جو جو
یگانہ و شرفِ روزگار تھے جو جو
متین و صاحبِ عز و وقار تھے جو جو
زمیں پہ باعثِ صد افتخار تھے جو جو

فلک نے اُن ہی کو چن چن کے پائمال کیا
اُنھیں کو موردِ صد رنج و صد ملال کیا

اب اس میں دل کو ہے مثلِ آئینہ کے حیرانی
بسانِ زلف ہے خاطر کو یہ پریشانی
کہ اس طرح کی لطافت جہاں تھی ارزانی
یہ دل میں کہتا ہوں سن سنکے وہاں کی ویرانی

الٰہی خواب تھا یا وہ خیال تھا - کیا تھا
وہ واقعی تھا کہ یا احتمال تھا - کیا تھا

فلک کی آنکھ نہ تھی جن کو دیکھنے پاتی
نہ تھی مجال صبا کی جو اُن تلک جاتی
خدا نے دی تھی اُنھیں ایسی عصمتِ ذاتی
کہ نامِ غیر جو سنتے تو اُن کو شرم آتی

فلک نے بخشا ہے اُن کو لباسِ عریانی
ہے ستر اُن کے لیئے اُن کی پاک دامانی

غرض فقط میری اس داستان سے یہ ہے
مآل کار میرا اِس بیان سے یہ ہے
مراد اُن کی بس اظہارِ شان سے یہ ہے
حصول شرح مکین و مکان سے یہ ہے

کہ ایسے ایسے مکین و مکاں خراب کیئے
فلک نے سب دل و جان و جگر کباب کیئے

وہ دل ہی کونسا اس غم سے جو خراب نہیں
وہ جان کونسی ہی جس کو اضطراب نہیں
وہ کون شخص ہی جو گردِ پیچ و تاب نہیں
اب آگے حال کے لکھنے کی مجھ کو تاب نہیں

کروں ہوں ختم دعا پر دیے قبول ہو وا
خدا سے عرض ہی اب یہی اپنی صبح و مسا

الٰہی کر دے پھر آباد باغِ دہلی کو
مے نشاط سے بھر دے ایاغِ دہلی کو
کر اپنے فضل سے روشن چراغ دہلی کو
دلوں سے خلق کے تو دھو دے داغِ دہلی کو

دعا ہی تجھ سے یہی اے مسبب الاسباب
کر اپنے ابر کرم سے وہ باغ پھر شاداب

اُنھیں مکینوں سے پھر وہ مکان ہوں آباد
رکھ امن میں اُسے اور اُس کی آل اور اولاد
الٰہی عیشِ جگر خستہ کا بھی کر دل شاد
بحق سید کونین و آلہ الامجاد

پھر اُس کو ویسا ہی آباد کر خدائے کریم
بحق سورۂ یسین و سورۂ حٰم [1]

ایضاً

کیا کہوں اس فلکِ شعبدہ گر کی نیرنگ
متحیر ہیں سُن اس حال کو اہلِ فرہنگ
دیکھ کر اُس کے طلسمات سنا عقل ہی دنگ
اُن پہ کیا سُن کے ہی اس ظلم سے ہر ایک دل تنگ

شمع ساں سب کو کیا خاک جلا کر اُس نے
چھوڑا بس خاک میں ایک ایک کو ملا کر اُس نے

[1] حا۔م

نہیں ایسا کوئی دل جو نہیں اس غم سے دوچار — کس کے دل میں نہیں اس غم کا ہی بتلاؤ تو خار
سُن کے اس حال کو سینہ نہیں ہی کس کا فگار — کون ایسا ہی جو اس غم سے نہیں زار و نزار

کونسا دل ہی جو اس غم میں گرفتار نہیں
کونسی آنکھ ہی اس غم سے جو خونبار نہیں

ڈالا اوقات میں اُن اہلِ کمالوں کے خلل — عقدے حل ہوتے تھے جن پاس کہ مالاینحل
قول کو جن کے سمجھتے تھے یہ قولِ فیصل — اُن کی کیونکر نہ ہو حالت متغیر پل پل

دل سے بے چین ہیں خاطر سے پریشان ہیں وہ
کچھ میسر نہیں ہر چیز سے حیران ہیں وہ

اور سوا اس کے ہیں جانوں کے بڑے اندیشے — دل پہ پڑتے ہیں پڑے اُن کے غموں کے تیشے
ڈر سے جانوں سے لگے کرنے وہ ارزل پیشے — جوتیاں بیچے ہی اُن میں کوئی میشنے[۵]

اس پہ بھی چین نہیں جان کو بیتابی ہی
اُن کی قسمت میں فقط بیخور و بیخوابی ہی

ابرِ غم دل پہ ہی ہر شخص کے ایسا چھایا — چرخ نے اُن پہ سنا غم کا یہ مینہ برسایا
اُن کا اس چرخ ستمگر کو یہ عالم بھایا — یاں تلک رو دئے کہ بس منہ کو کلیجا آیا

اشک دن رات بس آنکھوں سے پڑے جھڑتے ہیں
اور سات اُن کے یہ کٹ کٹ کے جگر گرتے ہیں

تھے وہ جن باغوں میں اقسام کے میوے پُر نور — ناشپاتی وہی سیب و انار و انگور
اور اسی قسم کے میووں سے چمن تھے معمور — اُن کی بو باس سے ہو جاتا تھا خفقان بھی دور

باغ اُنھیں باغوں میں ہیں چار طرف خاک کے ڈھیر

[۵] بھیڑ بکری کی کھالیں

اور گل و غنچہ کی جا ہیں خس و خاشاک کے ڈھیر

دیکھ ہاں سبزے کا اور آبِ رواں کا عالم
اور ہی ہوتا تھا وہاں پیر و جواں کا عالم
جمع ہوتا تھا وہاں ایک جہاں کا عالم
کچھ بیاں ہو نہیں سکتا ہے وہاں کا عالم

یا وہاں کانٹوں کے اب ڈھیر میں اور پتے ہیں
تھے جہاں پھول نجاست کے وہاں کٹّے ہیں

جس جگہ رہتے تھے پریوں کے اکھاڑے دن رات
مہروش کرتے تھے وہاں سیر لیے ہاتھ میں ہات
اور ہر طرح کی موجود تھیں اُن کو نعمات
جُز خوشی سُننے میں آتی نہ تھی اُس جا کچھ بات

یا وہی جا ہے کہ انسان کا وہاں نام نہیں
اور جو ہے کوئی تو بس غم کے سوا کام نہیں

وہ پریزاد جنھیں دیکھ کے جان آتی تھی
نام سے اُن کے سدا روح مزا پاتی تھی
بیٹھے بیٹھے جو طبیعت کبھی گھبراتی تھی
اُن سے ملتے تھے تو فوراً یہ بہل جاتی تھی

خاک میں اُن کو ہر اک طرح ملایا اُس نے
ہم جگر سوختوں کو اور جلایا اُس نے

وہ نہ جو پاؤں نزاکت سے زمیں پر دھرتے
بات بھی کرتے کسی سے تو اشارا کرتے
اُن سے کچھ چپکے بھی کہتے تھے تو ڈرتے ڈرتے
مرد و زن پیر و جواں دم تھے سب اُن کا بھرتے

خاک اب چھانتے پھرتے ہیں وہ صحراؤں میں
اور ستم اس پہ کہ چھالے ہیں پڑے پاؤں میں

جامِ عشرت سے سدا رہتے تھے دن رات جو مست
اور موجود وہاں رہتے تھے سب بادہ پرست
بزم میں اُن کی سدا اہلِ طرب کی تھی نشست
ہاتھ اُٹھائے تھی وہ سب رنج و الم سے یکدست

اب وہ غم کھاتے ہیں اور خونِ جگر پیتے ہیں
خاک جیتے ہیں مگر کہنے کو ہاں جیتے ہیں

تھا وہ جن لوگوں کے ہاتھوں کی نزاکت کا یہ حال
خوابِ مخمل سے کفِ پا کو تھا ہاں اُن کے ملال
بارسے رنگِ حنا کے وہ ہوئے جاتے تھے لال
ہنسکے ہوتے تھے نظر گرمی سے وہ چاند کے گال

اب وہی لوگ ہیں اور بادیہ پیمائی ہے
مل گئی خاک میں سب میری و مرزائی ہے

جن کو موجود تھی جمعیتِ خاطر ہر دم
اور آرام سے شیرازۂ خاطر تھا بہم
خوابِ راحت نہ تھی جن کو کہ فرصت ہر دم
کیا کروں عیش میں اُن لوگوں کا احوال رقم

یعنی اب لف ہے وام اُن سے پریشانی کو
آئینہ لیتا ہے مول اُن سے ہی حیرانی کو

ایضاً

مل گئی خاک میں شانِ دہلی
نہ رہا نام و نشانِ دہلی

نہیں برباد ہوا کوئی مکاں
آہ دنیا ہیں بیانِ دہلی

ہوگیا کیا کہوں پامالِ ستم
ہائے ہر ایک مکانِ دہلی

دشتِ غربت میں پھریں چھانتے خاک
یوں فلک پیر و جوانِ دہلی؟

گردِ کلفت ہوئے افسوس افسوس
غازۂ ماہ رُخانِ دہلی

شان و شوکت ہوئی اُن کی برباد
جن سے تھی شوکتِ شانِ دہلی

کیا ہوا فائدہ ای چرخ تجھے
سچ بتا کرکے زیانِ دہلی

دیکھ کہتی تھی جسے چشمِ فلک
کھا کے سوگند بجانِ دہلی

دوسرا گلشن دنیا میں چمن
"نہیں سرسبز بسانِ دہلی"

سو وہ ایسی ہوئی برباد کہ ہیں
بلبلیں مرثیہ خوانِ دہلی

نخلبندِ چمنِ دہر کو کیا
نا پسند آئی تھی آنِ دہلی

یک قلم یوں جو کئے اُس نے قلم
نخلِ امیدِ کسانِ دہلی

قمریاں کرتی ہیں کوکو غم میں
کرکے اس طرح بیانِ دہلی

"مل گئے خاک میں کیسے کیسے
ای فلک سرو قدانِ دہلی"

عندلیبانِ چمن ہیں نالاں
یاد کر غنچہ لبانِ دہلی

پہنی سوسن نے ہی نیلی پوشاک
کھا غمِ ماتمیانِ دہلی

پیچ کھاتی ہے یہ سنبل کر یاد
زلفِ پُرپیچ بتانِ دہلی

لالہ ہے داغ بہ دل کرتا ہے
یادِ خالِ پریانِ دہلی

یاد کر کرکے ہے نرگس حیراں
نگہِ خوش نگہانِ دہلی

خوں بدل شام و شفق ہے فریاد
زیبِ لب مسّی و پانِ دہلی

گل کھلایا یہ نیا عالم میں
گل بے نیرنگِ خزانِ دہلی

اب کہاں ہے وہ کلامِ شیریں
ہے کہاں اب وہ زبانِ دہلی

پیشہ ور ایسے کہاں ہیں پیدا
جیسے تھے پیشہ ورانِ دہلی

مل گئے خاک میں سب اہلِ کمال
مر مٹے قاعدہ دانِ دہلی

الغرض چرخِ جفا کار نے آہ
خوانِ یغما کیا خوانِ دہلی

دل بھرا آتا ہے خاموش ہو عیش
تجھ سے سُن سُن کے بیانِ دہلی

ایضاً

کیا جانے اہلِ دہلی سے کیا بات ہوگئی
جو دہلی ایسی موردِ آفات ہوگئی
تھی رات واں کی دن سے بھی روشن زیادہ تر
یا وہ ہی ہے کہ دن کی وہاں رات ہوگئی
ہر شب شبِ برات تھی ہر روز روزِ عید
یا اب وہ جا محلِ مکافات ہوگئی
یہ واردات دہلی کی وہ ہے کہ یاں تو کیا
مشہور تا بسبع سمٰوات ہوگئی
جو سرزمیں کہ مسکنِ قدسی صفات تھی
اب اس طرح وہ وقفِ بلیات ہوگئی
نقشِ قدم کی طرح سے سب خاک میں ملے
لو اب وہ جائے مدفنِ اموات ہوگئی
مت پوچھیے بگڑتے ہی دہلی کے کیا کہیں
کیا واردات خلق پہ ہیہات ہوگئی

لہ بتخفیف اہل

دیکھا بقولِ حضرت سودا تو عیش بس
دنیا تمام بزمِ خرابات ہوگئی

ایضاً

حالِ عالم آہ کیف و کم میں کیا تھا کیا ہوا
یا اولی الابصار دیکھو دم میں کیا تھا کیا ہوا
جائے عبرت ہے کہوں کیا تم سے اے اہلِ نظر
دفعتاً دیکھو تو رنگ عالم میں کیا تھا کیا ہوا
فصلِ خوردی و جوانی تو وہ گذری چین سے
اب ہی پیری سو اس موسم میں کیا تھا کیا ہوا
جس طرح اوراق کو ہو نسخے کے ابتری
ویسی ہی اس دورۂ عالم میں کیا تھا کیا ہوا
کیا کہوں میں تفرقہ پردازیاں اس چرخ کی
دوستوں میں اختلاط اور ہم میں کیا تھا کیا ہوا
اے دلِ ناداں تو اب اس بات کا شاکی نہ ہو
ربط باہم دیکھ جام و جم میں کیا تھا کیا ہوا

جز خداوندِ جہاں حالِ دل اپنا علیش بس
کس سے کہیے دوستوں کے غم میں کیا تھا کیا ہوا

غالبؔ۔ اسد اللہ خاں الملقب بہ مرزا نوشہ والمخاطب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ مرحوم دہلوی

۸ رجب ۱۲۱۲ھ ۱۷۹۷ء کو اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ پانچ برس کی عمر میں یتیم ہوئے ۱۱ برس کی عمر میں اُنکے سرپرست چچا کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ خاندانی جاگیر سے سات سو روپیہ سالانہ ملتے تھے پچاس روپیہ ماہوار خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کے معاوضے میں مع خلعت و خطاب بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے خزانے سے ملتے تھے ۱۸۵۷ء میں یہ دونوں سلسلے ختم ہوگئے تو ریاست رامپور میں آئے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم مرحوم ان کے شاگرد تھے انھوں نے ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ ماہوار مقرر کردیا۔ اور قیام رامپور کی حالت میں سو روپیہ ضیافت کے مقرر کر دیئے مگر مرزا مرحوم دلی چلے آئے یہاں آکر خاندانی پنشن بھی ملنے لگی۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں انتقال ہوا اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے جوار میں "چونسٹھ کھمبا" کے قریب دفن ہوئے۔ اب ان کا مزار ایک حریم کے اندر جانب غرب ہے۔ قبر کے سرہانے ایک پتھر نصب ہے۔

بس کہ فعّال ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستان کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب۔ انساں کا

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جاسکے یاں کا

میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا

گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزش داغہائے پنہاں کا

گاہ رو کر کہا کیے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارب — کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

ذیل کا قطعہ بھی مرزا صاحب نے انھیں حالات سے متاثر ہو کر لکھا ہے

قطعہ

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس — یوں کہا آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب
بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے — یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

فرحت - کنور بشن پرشاد آنجہانی دہلوی

کوئی مفلسی میں ہے مبتلا کوئی تنگ حالی سے خوار ہے — کوئی بے کسی میں اداس ہے کوئی رنج سے تہ بار ہے
جسے دیکھو آہ زمانہ میں وہ الم سے زار و نزار ہے — ہے کوئی فلک سے شکستہ دل کوئی غم سے سینہ فگار ہے
یہ اٹھائے لوگوں نے غم پہ غم نہ حساب ہے نہ شمار ہے

ہوا چرخ دل میں نہ کچھ خجل گیا خاک و خوں میں جہان مل — کوئی دل ہی دل میں ہے منفعل کوئی سوز الم میں ہے مشتعل
جو ہیں سو فلک سے شکستہ دل تو ہزاروں ہو گئے زیر گل — کئے جور و ظلم یہ مسلسل کہ زمانہ غم سے ہے مضمحل
دلِ بے کسوں کی طرف سے تو ابھی اس فلک کو غبار ہے

گیا سر بسر یہ اجڑ جہاں ہوا انقلاب یہ ناگہاں — نہ وہ عیش و عشرت جاوداں نہ زمیں ہے نہ وہ آسمان
کیا تو نے کیا اے آسماں گئے سب کے سب وہ چمن کہاں — ہوئیں کب یہ بیکسی و اداسیاں وہ گل ہے اور نہ وہ بوستاں
یہ کہاں سے آگئی اب خزاں نہ وہ باغ ہے نہ بہار ہے

یہ اٹھائے صدمۂ رنج و غم کہ ہیں زندگی سے بھی تنگ ہم — کیا سو فلک نے بھی بند دم کوئی اور جیتے ہیں دم کے دم
کیا غدر چرخ نے یک قلم ہوا مرد و زن میں یہ کیا ستم — رہیں کیوں نہ اشک سے چشم نم ہوا کیسا دہلی میں ہائے غم
ہمیں روز اسی کا ہے ایک الم کہ اجڑ گیا یہ دیار ہے

کروں کیا میں کثرتِ غم بیاں کہ الم میں پھنسا ہوں زماں
پڑا غمکدہ میں ہوں نیم جاں کوئی ہمنفس ہے نہ مہرباں
کہوں کس سے کون ہے رازداں مرے غم کی طول ہے داستاں
یہ بلا ہیں غم کی گرانیاں کہ ہے زندگی سے خفیف جاں
مجھے چھوڑ کر گئی ہے اجل کہاں جہاں سانس لینا بھی بار ہے

نہ تھا اندنوں کا خیال جب وہ مزے سے گذرے تھے روز و شب
کوئی دل میں اپنے تھا پُر طرب کوئی سو خوشی سے تھا خندہ لب
ولے کیجے دل میں جو غور اب تو جہاں کی طرز ہی کچھ عجب
جو خوشی سے رہتے تھے خندہ لب وہ ہیں غم کے ہاتھوں سے پُر تعب
پڑے یاس بیکسی الم میں سب نہ تو صبر ہے نہ قرار ہے

نہ ادا اس غم میں جو ہیں قدر نہ قلق سے نالاں ہو ہر سحر
نہ پھر افغاں ہے تو مفت سر نہ فلک کے جوروں سے نالہ کر
تجھے کچھ خبر بھی ہے بے خبر کہ یہ بختِ بد کا ہے سب اثر
کہاں ماں فرحتِ نوحہ گر نہ الم میں تنہا ہو چشم تر
نہیں خوب رونا یہ سربسر کہ جگر پہ غم سے بخار ہے

قمرؔ حکیم غلام رسول خاں مرحوم دہلوی

کیا کروں دوستو میں تم سے بیانِ دہلی
عشق میں قلعہ کے جاتی رہی جانِ دہلی
کیا ہوا مٹ گیا گر نقشۂ دلّی یارو
شہر اب بھی کوئی ہو گا نہ بسانِ دہلی
لے گیا ہے فلکِ پیر اُٹھا کر شاید
جو فرشتوں کو ہے گردوں پہ گمانِ دہلی
نہ رہا کوئی خدایا کریں کس کی تعریف
چاندنی چوک دریبہ نہ جوانِ دہلی
چرخِ بد بیں سے خدایا یہ بچیں گے کیونکر
اب یہ باقی جو ہیں دو چار جوانِ دہلی
سچ ہے جب تک نہ ہوں شاگردِ قمرؔ اہلِ اودھ
کیونکہ پیدا کریں وہ لوگ زبانِ دہلی

کامل مرزا باقر علی خاں مرحوم دہلوی

تمام گلشن عیش و سرور تھی دہلی — تمام عشرت و فرحت ظہور تھی دہلی
تمام مطلع خورشید نور تھی دہلی — تمام غیرت صد کوہ طور تھی دہلی
ہر ایک کوچہ یہاں کا تھا اک مکان عیش
یہ شہر تھا کہ الٰہی کوئی جہان عیش

ملک صفات تھا یاں کا ہر ایک فرد بشر — برا ہی یاں کا زمانے کے خوب سے بہتر
یہاں کے عام کو تھا فوق خاص دنیا پر — یہاں کے نام سے بکتا تھا مس بھی زر ہو کر
یہ فوج باغیہ کیا شہر میں خدا آئی
کہ قہر آیا غضب آیا اک بلا آئی

یہاں کے لوگوں کی کٹتی تھی عمر عشرت میں — جو روز عیش میں گزرا تو شب مسرت میں
پڑے ہوئے ہیں وہی اب تو رنج و حسرت میں — پھنسے ہیں غم میں گرفتار ہیں مصیبت میں
وہ شاہزادے کہاں اور وہ بادشاہ کہاں
رہا جو کوئی تو وہ مرتبہ وہ جاہ کہاں

یہ قلعہ رشک دہ گلستان رضواں تھا — یہ قلعہ خلد تھا اس میں ہر ایک غلماں تھا
یہ قلعہ تھا کہ خدایا کوئی پرستاں تھا — یہ قلعہ ہیکل دنیا کے واسطے جاں تھا
نہ رہنے والے رہے اور نہ وہ مکان رہا
فقط دکھانے ہی کے واسطے نشان رہا

سنے جو کوئی تو ہاں درد دل عیاں کیجیے — صدائے طائر گم گشتہ آشیاں کیجیے

حیات بخش کا گر ماجرا بیاں کیجے — تو چاہیئے کہ بہت نالہ و فغاں کیجے

یہ وہ جگہ ہے کہ جنت کو جس سے غیرت آئے
جو دیکھیں حور و ملک بھی کبھی تو حسرت آئے

وہ لال پردہ کہ تھا جس سے احتشام عیاں — خوشی سے خسرو پرویز ہو جہاں قرباں
عوام کو تو وہاں جانے کی مجال کہاں — کہ خاص خاص ہی جاتے تھے بس تو سجدہ کناں

جھکے ہی رہتے تھے جس جائے اک جہان کے سر
قدم بھی اب نہیں دھرتا ہے واں کوئی جا کر

یہ چوک وہ ہے کہ میلہ تھا جس جگہ ہر روز — یہیں تو رہتے تھے مہ طلعتان دل افروز
نظر کو ہوتی تھی کیفیت سرور اندوز — جدھر کو دیکھئے تھی اک بہار کلفت سوز

نشان بھی نہیں اب تو ہجوم خلقت کا
بنی ہے وہ ہی جگہ بس مقام عبرت کا

یہ وہ ہے مسجد جامع کہ جس میں اک جہاں — نماز کے لیئے آتا تھا دور دور سے واں
تبرکات جو اس میں تھے کیا ہو اُن کا بیاں — ادب سے کرتے تھے اُس کی زیارت اہل زماں

وہ اُس کی رونق بازار چار سو مت پوچھ
کہ ہم سے ہو نہیں سکتی ہے گفتگو مت پوچھ

نہ دیندار تھی یہ فوج اور نہ دینداری — سیاہ رووں کو آتی تھی بس سیہ کاری
نہ جانتے تھے وہ کچھ بے خبر ستمگاری — حرام خوروں کو ہر دم تھا شغل میخواری

تمام نامۂ اعمال کو سیاہ کیا
ملایا خاک میں سب شہر اور تباہ کیا

وہ لوگ سیکڑوں رہتے تھے جن کے ساتھ سوار
کیا پیادہ اُنھیں اے سپہرِ ناہنجار
اٹھائیں سر پہ وہ گٹھری کا کس طرح سے بار
اُٹھانا ایک قدم کا بھی جن کو ہو دُشوار
تہہِ زمین جگہ چاہیئے اماں کے لیئے
دُعائیں مانگتے ہیں مرگِ ناگہاں کے لیئے

نہ چھپے کوئی دم اور نہ تھمے کوئی آن
فسردہ دل ہیں جو کرتے تھے عیش میں گزران
ٹھکانے ہوش ہی ہیں نے بن آتے ہیں اوسان
ذلیل و خوار ہیں پھرتے ہیں جا بجا حیران
فلک نے پھینکدیا ہی کہاں کہاں اُن کو
بجائے زمزمہ ہی نالہ و فغاں اُن کو

الٰہی بھاگ کے یہاں سے کوئی کہاں جاوے
کوئی نظر میں ٹھکانا نہیں جہاں جاوے
کوئی جگہ نہیں جس جا پہ با اماں جاوے
اگر زمین پھٹے تو وہاں سما جاوے
دکھائی دیتا ہی ہر ایک عدوئے جاں اپنا
بنا ہی دُشمنِ جانی یہ آسماں اپنا

کہاں تلک کوئی اس غم کی داستاں لکھے
کہاں تلک کوئی کیفیتِ فغاں لکھے
کہاں تلک کوئی یہ دردِ خونچکاں لکھے
کہاں تلک کوئی بیدادِ آسماں لکھے
دُعائے کاملِ غمگیں ہو مستجاب خدا
بنی ہوئی نہ ہو کوئی جگہ خراب خدا

ایضاً

مٹ گیا پر نہ مٹا نام و نشانِ دہلی
لب پہ دہلی ہی تو نظروں میں ہی شانِ دہلی
اگلے عیشوں کا کہیں چرخ عوض لیتا ہی
اب مصیبت میں پڑے ہیں جو کسانِ دہلی

منھ کو اُبلا ہوا آتا ہی کلیجہ ہی ہی
ہمنشیں کیونکہ بھلا بیت کیجے بیانِ دہلی

جی بہارِ چمنِ دہر پہ کیونکر دھریئے
کہ نظر آتی ہی افسوس خزانِ دہلی

غم دیئے رنج دیئے اپنی گرہ سے ظالم
چرخ کیا تو نے لیا کرکے زیانِ دہلی

اب جو تعریف کرے کوئی تو حسرت سے کہوں
تو نے پہلے بھی کبھی دیکھی تھی شانِ دہلی

ضبطِ گریہ تو یہ دلّی نے کیا ہی گویا
نہیں پائی گئی یہ نہرِ روانِ دہلی

خانۂ کعبہ کو اب حضرتِ کاملؔ چلیئے
رہنے کا اب نہ رہا لطف میانِ دہلی

ایضاً

مٹ گئے ہائے مکیں اور مکانِ دہلی
نہ رہا نام کو بھی نام و نشانِ دہلی

سہمے سہمے نہ ہیں کیونکہ مقیمانِ فلک
کہ فلک ہی ہدفِ تیرِ فغانِ دہلی

ہمتو انسان ہیں جی کیونکہ رہے بن روئے
کہ فرشتے بھی ہوئے مرثیہ خوانِ دہلی

جیسے فارس میں خلاصہ ہی زبانِ شیراز
ویسی ہی ہند میں ہی پاک زبانِ دہلی

اس کی ویرانی میں ایک بات یہ دیکھی ہم نے
مٹ گئے پر بھی تو باقی رہی آنِ دہلی

جسمِ چرخ نہ انجم سے بنے آبلہ دار
گر نہ ہو در پے بربادیِ شانِ دہلی

بسکہ ہنگامہ طلب تھا یہ مکاں پہلے سے
فتنۂ حشر بھی ہووے گا میانِ دہلی

جو مکیں رہ گئے بے گور وکفن مر مر کر
ڈھانپنے پردہ کرے ان پہ مکانِ دہلی

غالبؔ و سالکؔ و ثاقبؔ ہی نہیں ہیں غمگیں
کوکبِ خستہ بھی کرتا ہی فغانِ دہلی

لطفؔ میر لطف علی مرحوم لکھنوی وارد دہلی

حیف ہی اُٹھ گئے گیا پیر و جوانِ دہلی
خاک باقی نہ رہا نام و نشانِ دہلی

چہچہے بلبلوں کے رہتے تھے دن رات جہاں
مسکنِ فاختہ ہی اب وہ مکانِ دہلی

ہر روش پر ہیں خراماں اب اُسی طرح سے غیر
جیسے گلگشت میں تھے سروِ روانِ دہلی

اب تو ایک ایک پہ گزر جاتے ہیں گھر میں دو دن
جو غریبوں کو دیا کرتے تھے خوانِ دہلی

رہ گیا قالبِ بے نور فقط آنکھوں میں
ملک الموت اُڑا لے گئے جانِ دہلی

سُن کے ہر طرز کو اطراف و جوانب والے
وجد کرتے تھے جو ہوتا تھا بیانِ دہلی

اس قدر گریہ و زاری میں ہیں اب پسماندہ
جس سے گردوں پہ گئی آہ فغانِ دہلی

جلوہ گر رہ گئے ہیں چند یہاں صاحبِ دل
مثلِ خورشید وہ روشن ہیں میانِ دہلی

نور سے قدرتِ باری کے ضیا دین کو ہی
ورنہ ہیں بے حس و حرکات کسانِ دہلی

اہل حرفہ کے سوا چین کسی کو بھی نہیں
پھرتے ہیں سب متردد پے نانِ دہلی

اُٹھ گیا لطفِ محبت نہ رہا دل کو قرار
کون ہی جس کو نہ پہونچا ہو تکانِ دہلی

مبینؔ حافظ غلام دستگیر صاحب مرحوم دہلوی

پسندِ خاطرِ ہر خاص و عام تھی دہلی
طلسمِ دل کش و جنت مقام تھی دہلی

تمام ملک میں بس نیکنام تھی دہلی
گلِ خوشی سے معطر تمام تھی دہلی

اُجاڑا ایسا چمن جس کے غم سے دل ہی خوں

سے مٹے خزاں کی ہوا خاک میں ملے گردوں

بلا بلا پہ ہے نازل خراب ہے دہلی
ستم ہے موردِ ظلم و عتاب ہے دہلی
تباہ ہو گئی کیسی شتاب ہے دہلی
ہزار حیف کہ وقفِ عذاب ہے دہلی

ہوا جو دیدۂ غور غم سے سُرخ کیا ہے عجب
کہ تارِ اشک ہے تارِ شعاعِ مہر میں اب

مثالِ خلدِ بریں بے مثال تھی دہلی
سپہرِ اوجِ تجلی مآل تھی دہلی
گلِ کمال سے پُر یہ کمال تھی دہلی
غبارِ غم سے صفا مہ جمال تھی دہلی

چمن طراز یہ دہلی فلک کو خار ہوئی
نیازِ برقِ فنا نزہتِ بہار ہوئی

یہ شہر وہ تھا نہ تھا غم خوشی کی تھی کثرت
یہ شہر وہ تھا کہ بنتے تھے گلشنِ عشرت
یہ شہر وہ تھا نہ تھا رنج تھی عجب راحت
یہ شہر وہ تھا کہ ہوتی تھی دل کو یاں فرحت

ملی وہ خاک میں صورت کہ رو رہا دل ہے
مٹی وہ شکل کہ ہر خشت فردِ باطل ہے

یہ شہر وہ تھا کہ جانِ جہاں تھا اس کا خطاب
یہ شہر وہ تھا کہ آرامِ جاں تھا اس کا خطاب
یہ شہر وہ تھا کہ جنت نشاں تھا اس کا خطاب
یہ شہر وہ تھا کہ گوہر فشاں تھا اس کا خطاب

کیا حوادثِ دوراں نے اس کو بھی پامال
یہ صادق آئی مثل ہر کمال کو ہے زوال

یہی تھا رشکِ جناں شہر اب ہے خارستاں
یہی تھا عیش وطن شہر اب ہے جو ویراں
یہی تھا حسن کدہ شہر اب ہے صرفِ خزاں
یہی تھا حورستاں شہر اب ہے وحشتستاں

یہ شہر خلد تھا ویرانیوں کا اب گھر ہے
جسے بہار ہی اُس کو خزاں مقرر ہے

یہ وہ جگہ تھی یہاں سے قدم نہ اُٹھتا تھا
یہ وہ جگہ تھی کہ غم تھا نہ کوئی بھی اس جا
یہ وہ جگہ تھی مسافر وطن تھا نام اس کا
یہ وہ جگہ تھی کہ ہر درد کی بہم تھی دوا

ہوا کچھ ایسی چلی خاک میں ملا یہ شہر
خرابہ و الم آباد بن گیا یہ شہر

یہاں کا روز تھا ہر روز روزِ عید جہاں
یہاں کی شام تھی چوں زلفِ عنبر بتاں
یہاں کی شب تھی شبِ قدر ماہِ نور افشاں
یہاں کی صبح تھی ہم نورِ عارضِ خوباں

یہ دہلی وہ تھی کہ جس سے جہان روشن تھا
یہ شہر وہ تھا کہ نام اس کا نور مخزن تھا

ہر ایک شام یہاں کی تھی شامِ مشک ایجاد
یہاں کی آن تھی آن سمنبرِ نوشاد
یہاں کی شب شبِ راحت تھی روز روزِ دو
یہاں کی ہر گھڑی پُر عیش تھی طرب آباد

خدا ہی جانے اسے بد دعا لگی کس کی
کھلا ہنسی پہ لب حرفِ غم مٹی یہ ہنسی

عمارتوں سے بنا تھا طلسم خانہ گھر
ہر ایک خشت تھی آئینہ اور گِل عنبر
نہ جسم خانہ میں آتی وہاں سے چھپکے نظر
بہشت خانہ تھا ہر خانہ صفا پرور

فلک نے ڈھایا ستم شہر یہ خراب ہوا
عذاب کا بھی فرشتہ یہاں پر آب ہوا

یہاں کے لوگ تھے علم و ہنر میں سب کامل
یہ تھا وہ ملک کہ تھی اس سے جملہ شئی حاصل

حکیم و شاعر و عالم مہندس و عاقل — سبھی تھے جمع یہ تھا شہر دید کے قابل

ہزار حیف کہ بن بن کے بگڑیں تصویریں
ملیں گناہوں کی محشر سے پہلے تعزیریں

ہوا زمین کے ماتم میں چرخ نیلی پوش — ہر ایک کوچہ بھی یہاں کا تھا حجلۂ خاموش
کہاں وہ بزمِ نشاط اور کہاں خوشی کا وہ جوش — ہر ایک دل سے ہجومِ قلق ہے ہم آغوش

یہ فرطِ جنبشِ مژگاں سے حال روشن ہے
خوشی کا مردمکِ چشم کرتی شیون ہے

خجل تھا جن سے ہر ایک گل وہ ایسے خار ہوئے — مثال سبزۂ بیگانہ ہائے خوار ہوئے
بسانِ ابرِ گہربار اشکبار ہوئے — قرار دل کا گیا غم سے بے قرار ہوئے

وہ کم ہے ذرّہ سے جو شکل آفتاب سی تھی
وہ غرقِ خوں کفِ نازک ہے جو گلاب سی تھی

یہ وہ جگہ ہے کہ جس پر برستی ہے حسرت — یہ وہ جگہ ہے کہ حیراں ہے دیدۂ حیرت
یہ وہ جگہ ہے رلاتی ہے کثرتِ عبرت — یہ وہ جگہ ہے جسے کہیے محشرِ آفت

یہ وہ جگہ ہے فرشتوں کی جان ڈرتی ہے
یہ وہ جگہ ہے کہ دم مرگ جس کا بھرتی ہے

ہر ایک سو ہے یہ غارت گری سے ویرانہ — کہ مثلِ دیدۂ گریاں ہے ہر درِ خانہ
رلا رہا ہے فرشتوں کو بھی یہ افسانہ — نہ وہ ہیں گھر نہ وہ محفل نہ شمع و پروانہ

بنا ہے گنجِ شہیداں بسانِ خرمنِ گل
فرشتے نعشوں پہ اب نالہ کش ہیں جوں بلبل

جو ہائے پھولوں کے گنتھے کو کہتے تھے بھاری　　انھیں نصیب ہے طوق کرتے ہیں زاری
یہ اُن کی نازکی اور حیف قید کی خواری　　دموں پہ آن بنی جان سے ہے بیزاری
وہ رو کے کہتے ہیں زنداں سے کیونکہ ہوں باہر
کہ ہم کو روکے ہے زنجیر پاؤں پڑ پڑ کر

فلک نے چھین لیا ہائے جان کا آرام　　سحر ہے شعلہ فشاں پیکرِ بلا ہے شام
وہ فتنہ زا ہے زمیں خوش نہیں ہے کوئی مقام　　خوشی کی کیا ہو خوشی غم سے جو کہ ہو ناکام
اُداس پھرتے ہیں کوئی خوشی نہیں بھاتی
یہ دل پہ غم ہے کہ لب پر ہنسی نہیں آتی

قیامت آئی قیامت ہے کس لئے پہلے　　دکھائے کس لئے قسمت نے حادثے ایسے
جو غم نہ سہنے کو جی چاہے آنکھ سے دیکھے　　کہاں تلک کوئی روئے کہاں تلک پیٹے
کہیں پدر ہے تڑپتا کہیں پسر بیتاب
غضب ہے تفرقہ پرداز چرخ خانہ خراب

جو انتخاب جہاں میں تھے نازنیں دلبر　　فلک سے کہتے ہیں دکھلا کے اپنے دیدۂ تر
ستم ہے کیسا ہے یہاں نیند آئے اب کیونکر　　یہ سنگ خارہ کا تکیہ یہ خاک کا بستر
الٰہی خاک میں مل جائے گردشِ ایام
گھڑی گھڑی ہے قیامت کی دشمن آرام

جو یاد آئے شبستانِ عیش کی لذت　　نہ ہو نصیبِ دل و جاں کبھی گلِ راحت
نہیں ہے رونے سے دن رات کے ذرا فرصت　　ٹپکتے اشک ہیں ہر دم برستی ہے حسرت
وہ طرزِ گریہ کہ روتا ہے جس پہ ابرِ بہار

وہ اضطراب کہ تڑپے ہے برق سو سو بار

گھر ایسے لٹ گئے ہوئے ہیں خراب کیا میں کہوں — کہ جیسے خشک ہوں بے اشک دیدۂ پُرخوں
نہ زر نہ سیم نہ پوشاک فی دُرِ مکنوں — لبوں پہ آتے ہیں اب نالۂ دلِ محزوں

جو دُر فشاں تھے کفِ دست ہیں حرف آگیں
گُہر جو دیتے تھے کوڑی بھی اُن کے پاس نہیں

وہ لوگ جن کے دروں پر ہجومِ خلقت تھا — اور اُن کے نام سے زندہ تھا نام حاتم کا
وہ دربدر ہوئے ایسے تباہ اور رسوا — کہیں زمین پہ اُن کو ملی نہ امن کی جا

فلک کو دیدۂ حسرت سے بھوک میں دیکھا
ہلالِ چرخ کو سمجھے وہ نان کا ٹکڑا

جو لوگ دیتے تھے زر ان کے ہارے پھیلے ہات — رُلا رہی ہے اب ایسوں کو مفلسی ہیہات
دموں پہ آن بنی اُن کے اور بگڑی بات — فقط ہے گوشۂ تنہائی میں خدا کی ذات

ہزاروں جن کے تھے نوکر اکیلے پھرتے ہیں
وہ رو کے اُٹھتے ہیں ناطاقتی سے گرتے ہیں

وہ ازدحامِ غم و یاس و حسرتِ پیہم — وہ دل ہے غمکدہ جس میں خوشی کا ہے ماتم
دکھا رہا ہے فلک وقتِ صبح روئے ستم — بنا ہے چشمۂ حسرت ہر ایک دیدۂ نم

نصیب کنجِ مصیبت میں آہ و زاری ہے
ہزار طرح کی آفت ہے بے قراری ہے

خدا کی شان جو رکھتے تھے چوبدار نقیب — بنایا طالعِ بد نے ہے اُن کو ایسا غریب
نہ فرق نوکر و آقا میں اب ہے ہائے نصیب — چھپاتے پھرتے ہیں منہ وہ بنے ہیں شکلِ عجیب

پھر آئی کوچۂ رسوائی میں ہے اب تقدیر
ہر اک کے در پہ ہیں دریوزہ گر امیر و کبیر

جو پاؤں خوگرِ گل تھے نثارِ خار ہوئے
جو دل کہ موجدِ راحت تھے بے قرار ہوئے
جو ہاتھ پُر تھے نزاکت سے وہ فگار ہوئے
جو لوگ عیش پہ نازاں تھے اشکبار ہوئے

بنی کچھ ایسی دموں پر کہ آہ بھرتے ہیں
اجل کے نام سے ڈرتے تھے جو وہ مرتے ہیں

دوشالہ پوش تھے جو بے کفن زمیں میں گئے
بجا ہے آنسوؤں پہ چشمِ فلک بھی گر رو دے
جو قصر رکھتے تھے بے گورِ خاک میں وہ ملے
یہ وہ ہے غم کہ گریبان جامہ ہے ٹکڑے

نشانِ گور میسر نہ خاک پر ہے چراغ
چراغِ گور کے بدلے ہے دل کا روشن داغ

نہ آب و دانہ اسیرانِ غم کو ملتا ہے
بجائے آب ملے اشک رونے کی جا ہے
الٰہی یہ قفسِ چرخ رنج افزا ہے
غذا ہے غم کی شب و روز حال ایسا ہے

نہ شیر خواروں کو ملتا ہے شیر وائے غضب
زبان پھیرتے معصوم ہیں لبوں پر اب

نہ دیکھا تھا جو ستم وہ فلک سے اب دیکھا
پدر کے سامنے بیٹے کو قتل ہائے کیا
یہ وہ ہے حادثہ جس سے جگر بھی ٹکڑے ہوا
غم آئے یاد نہ کیونکر جنابِ اصغر کا

یہ کربلا کا نمونہ دکھاتی ہے دہلی
پدر کو نعشِ پسر پر رلاتی ہے دہلی

اگر ہو دفترِ محشر تو ہوئے صرفِ بیاں
نہیں زبانِ قلم کو ہے اتنی تاب کہاں

بنا ہی چشمۂ غم ہائے دیدۂ گریاں — جگر ہی ٹکڑے یہ وہ واقعہ ہوا ہی عیاں

نصیبِ دہلی کے چمکیں الٰہی ہو آباد
ہر ایک کوچہ ہو رشکِ صبایغ بہزاد

ایضاً

دل غنی رکھا سخاوت پہ نہ زر والوں نے — شکرِ نعمت نکیا ہم سے بد اقبالوں نے
گھر سے بے گھر جو کیا ہی تو انھیں چالوں نے — پھینکا صحرائے پُر آفت میں انھیں چالوں نے

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

ہائے کیا کیا نہ زمانے کے کیئے مکروہات — ناچ اور رنگ میں دن رات گزاری اوقات
عشق میں محو رہے بھول گئے صوم و صلوٰت — زر کی اُلفت میں ادا ہی نہ کیئے حج و زکوٰت

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

ہم ہوئے دام و درم غم کی خریداری ہے — جا بجا دامِ مصیبت کی گرفتاری ہی
ظلم جو جو کرے یہ اُس کی گنہگاری ہی — اب یہ کیوں جوشِ شکایت کی دل آزاری ہی

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

می کے بدلے ہمیں خونابۂ دل آہ ملا — دل کباب آتشِ عصیاں سے قیامت ہی ہوا
عیش مرحوم کا ماتم دلِ گریاں نے کیا — دن بُرے آئے نتیجہ ہی بُرائی کا بُرا

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

مجمع وعظ سے تھا ہمارے گریزاں یہ دل
تھی حسینوں کے فسانے پہ طبیعت مائل
انتقام عمل بد سے رہے ہم غافل
خاک ہے چین فلک سے ہیں بلائیں نازل

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

وائے ناکامی قسمت رہی غفلت ہر دم
نیک کاموں سے رہی ہم کو یہ نفرت ہر دم
مہ جبینان جہاں سے رہی صحبت ہر دم
تھی شبستان خرابات سے الفت ہر دم

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

بے سبب کاہے کو دیتی ہے یہ گردش تقدیر
ہیں سزاوار جفا یا دہی ہر ایک تقصیر
کیا زباں میں ہوا اثر اور دعا میں تاثیر
یعنی ہر جرم گزشتہ کی عیاں ہے تعزیر

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

کنج تنہائی میں کرتے نہیں غمخواری غم
چشمۂ اشک ندامت ہیں بنے دیدۂ نم
ساغر مے کے عوض لب پہ ہے توبہ ہر دم
عیش جتنے تھے کئے اتنے ہوئے رنج و الم

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

عرض یارب یہ مبتی کی ہے کہ اب بخشش کر
رحم جز تیرے کرے کون گنہگاروں پر

سوئے عصیاں منگر بر کرم خویش نگر | پڑھ کے اس مطلع پُر درد کو روتے ہیں بشر

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

ایضاً

یہ نئی ہے گردشِ چرخِ کہن | دشمن جاں ہے جفائے دل شکن
وہ بلا آئی گئی ہے دل پہ بن | اب نہیں ہے ہائے چارے دم زدن

پابرہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

پہلے محشر سے قیامت آگئی | حشر کی سر پر مصیبت آگئی
لب پہ گردوں کی شکایت آگئی | جان پُر افسوں پر آفت آگئی

پابرہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

لٹ گیا اسباب چھوڑا سب نے گھر | اب ہے صحرائے مصیبت کا سفر
حال بد پر اپنے ہر دم ہے نظر | اس مصیبت کی نہ تھی اصلا خبر

پابرہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

مفلسی کی ہر طرف اب ہے پکار | مال کو روتے ہیں اپنے مالدار
غم ہی کھانے کے لیے لیل و نہار | آب کی جا اشک دے ہے چشمِ زار

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

پاؤں میں جوتے نہ سر پر ہے کلاہ
ہے فلک کے ظلم پر سب کی نگاہ
تن ہے عریاں ساری خلقت ہے تباہ
خستہ دل اس سے ہیں داد خواہ

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

ہے قیامت کا نمونہ دیکھ لو
بھائی کی بھائی کو کب ہے جستجو
کچھ نہ بیٹے کی خبر ہے باپ کو
باغِ عالم میں نہیں الفت کی بو

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

پرسشِ گل کی جا ہے بسترِ خار کا
صدمہ ہے اندوہ کے آزار کا
رنگ فق ہے ہر جگر افگار کا
دل فسردہ حال ہے بیمار کا

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

خوابہائے عیش کو کیا ہو گیا
کیا کیا تو نے یہ چرخِ پُر جفا
یہ ہی افسانہ ہے کیا تھا کیا ہوا
یہ ستم تھا اے ستم گر کب روا

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

آہ برلب چشم پُرنم زرد رو
ہے پریشانی قیامت موبمو

ہائے ہائے کی صدا ہے چار سو	خاک میں سب کی ملی ہے آبرو

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

شہر تھا یہ ثانیِ خلدِ بریں	اس چمن کے گل ہوئے صحرا نشیں
ہو گئی ویران دہلی کی زمیں	اس ستم پر دل ہے روتا ہے میں

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

ایضاً

ہوئے دفن جو کہ ہیں بے کفن اُنھیں رُوتا ابرِ بہار ہے
کہ فرشتے پڑھتے ہیں فاتحہ نہ نشان ہے نہ مزار ہے
نہ تھا شہر خلد سے بھی یہ کم سبھی جا خوشی تھی نہ تھا الم
چلی ایسی بادِ سموم و غم نہ وہ رنگ ہے نہ بہار ہے
کہو کیونکہ اپنی ہو زندگی کوئی جائے امن نہیں رہی
کہیں تیغ تیز کھنچی ہوئی کہیں پھانسی ہے کہیں دار ہے
پھرے دشت دشت تباہ سب بُرے دن دکھائے فلک نے اب
نہیں تھمتے اشک ہیں روز و شب یہی شغل ہے یہی کار ہے
نہ وہ لوگ ہیں نہ وہ انجمن جسے دیکھو غم میں ہے نعرہ زن
نہ وہ سیرِ باغ نہ وہ چمن جہاں گل تھے کثرتِ خار ہے

جو دو شالہ پوش تھے مثلِ گل جو لبوں پہ رکھتے تھے جامِ مل
بنے دشتِ غم کے ہیں خار گل نہ قبا ہی تن پہ نہ تار ہے
ہوئی تنگ اُمتِ مصطفےٰ نہیں اُٹھتا صدمہ عذاب کا
کہیں رحم جلد ہو یا خدا بُرے وقت کا تو ہی یار ہے

لکھی وہ غزل ہے ہلالیؔ میں جسے سن کے روتے ہیں مہ جبیں
وہ ہے کون جس کو کہ غم نہیں یہاں سب کا سینہ فگار ہے

مجروحؔ میر مہدی مرحوم دہلوی

مرزا غالب کے ممتاز شاگرد رشید تھے ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا ان کے والد کا نام میر حسین فگار تھا اپنے والد کے تخلص کی رعایت کو ملحوظ رکھ کر اپنا تخلص مجروح رکھا تھا۔

یہ کہاں جلوۂ جاں بخش بتانِ دہلی
ان کا بے وجہ نہیں لوٹ کے ہونا برباد
جس کے جھونکوں سے ہوا طبلۂ عطار ہنی
سمجھے ہیں سوئے ادب جنتِ ثانی کہنا
یہ ستم دیکھ چکے تھے کہ رہے آسودہ
اس لیئے خلد میں جانے کا ہر اک طالب ہے

کیونکہ جنت پہ کیا جائے گمانِ دہلی
ڈھونڈتیں ہیں اپنے مکینوں کو مکانِ دہلی
ہے وہ بادِ سحر عطر فشانِ دہلی
وہ کچھ اشخاص جو ہیں مرثیہ خوانِ دہلی
فتنۂ حشر میں آفت زدگانِ دہلی
کہ کچھ ایک ڈر سے پڑتا ہے گمانِ دہلی

ضربتِ رشتۂ بیدادِ ستم سے مجروحؔ
صرفِ بیداد ہوئے منتخبانِ دہلی

محسن۔ حکیم محمد محسن خاں مرحوم دہلوی

دیارِ ہند میں یہ تخت گاہ تھی دہلی
ثریا جاہ فلک بارگاہ تھی دہلی
تمام شہروں کی پشت و پناہ تھی دہلی
گناہگار ہوئی بے گناہ تھی دہلی

یہ انقلابِ زمانہ سے ہو گئی برباد
اُکھڑ کے پھک گئی اب اس کی بیخ اور بنیاد

یہ شہر وہ ہے کہ تھا افتخارِ ہفت اقلیم
محلِ پایۂ اورنگ خسروانِ قدیم
شکوہ و رفعت و شوکت میں رشکِ عرشِ عظیم
فضا و حسن میں غیرت فزائے باغِ نعیم

خدا ہی جانے کہ اس پر لگی ہے کس کی نظر
ہر ایک قصبہ و قریہ سے ہو گیا کمتر

اسی کو کہتے تھے سب رشکِ خطۂ کشمیر
اسی کو کہتا تھا عالم مرقعِ تصویر
نہ تھا جہان میں اس کا کوئی عدیل و نظیر
مُہوّسوں کے لیے جس کی خاک تھی اکسیر

کوئی تو ایسا ہی سرزد ہوا ہے اس سے قصور
مثالِ بختِ سیہ ہو گیا جو یہ بے نور

اسی سے ہو گئی اقلیمِ ہند کو زینت
اسی سے پائی ہر ایک اہلِ ہند نے عزت
اسی کو دیتے تھے سب باغِ خلد سے نسبت
اسی کی ہو رہی سارے جہان میں شہرت

جہاں میں ہو گیا یہ شہر اس قدر بدنام
یہاں سے چھوڑ کے جاتے ہیں لوگ اپنے مقام

وہ لعل قلعہ جسے کوہِ طور کہتے تھے
فضا کو جس کی فضائے قصور کہتے تھے

وہ نازنین جنھیں رشکِ حور کہتے تھے
وہ شاہزادے جنھیں سب حضور کہتے تھے

رہا نہ کوئی حسین اور نہ کوئی وارث تخت
مٹانے تخت کو آیا تھا بخت خاں[۱] کم بخت

وہ لال پردہ کہ بس پردہ پوشِ عالم تھا
وہ مجراگاہِ سلاطین و حاتم و جم تھا
وہ گویا پردۂ پرنورِ چشمِ آدم تھا
وہ سجدہ گاہِ نریماں و زال و رستم تھا

تمام کھودتے پھرتے ہیں اس جگہ مزدور
ظہور اُس کا ہوا جو خدا کو تھا منظور

وہ تو محلہ کہ تھا رشکِ کوچۂ و بازار
ہر ایک مکاں تھا مصفا بصورتِ گلزار
طواف کرتی تھی ہر صبح جس کا بادِ بہار
بنا تھا کوچہ ہر اک اُس کا مصر کا بازار

اب اُس محلہ کا باقی رہا نہ نام و نشاں
نظر وہ قلعہ میں آتا ہے مثلِ گورستاں

وہ جنگلی ڈیوڑھی جو تھی رشکِ وادیِ ایمن
مہک رہی تھی وہ پھولوں سے صورتِ گلشن
کہ شمع طور تھی ہر ایک واں کی شمع لگن
سجی ہوئی تھی حسینوں سے مثلِ صحنِ چمن

وہ دشتِ قیس کے مانند ہو گئی ویران
جرس کی آتی ہے آواز اُس جگہ ہر آن

ہوئی وہ ڈیوڑھی کی بنیاد اس طرح برباد
نشان بھی نہ رہا اُس کا اب کسی کو یاد
کہ گویا پھینک دی اُس کی اکھیڑ کر بنیاد
ہر ایک دیکھ کے بس اُس کو کرتا ہے فریاد

الٰہی کیا ہوئے اب یاں سے وہ مکان و مکیں
فلک اُٹھا کے کہاں لے گیا ہے یاں کی زمیں

[۱] بریلی کے رسالہ کا افسر

وہ لال جوڑے پہن کر کوئی نکلتی تھی
وہ بانکپن سے اٹھا پائنچوں کو چلتی تھی
وہ ہاتھ پاؤں میں مہندی کو اپنے ملتی تھی
وہ بات بات میں انداز سے مچلتی تھی
ہوئے ہیں رنج و تردد میں اب تو وہ محبوس
بجائے مہندی کے ملتے ہیں وہ کفِ افسوس

دکھاتے اُن کو تبسم سے وہ لبِ اعجاز
سُناتے اُن کو وہ شوخی سے ناز کی آواز
مچل مچل کے دکھانا وہ اِن کا عشوۂ ناز
نئی ادا سے دکھانا وہ چال کا انداز
یہ اُن کا ہو گیا ہے اب تباہی سے احوال
کہ ساری بھول گئے اپنی وہ ادا کی چال

کسی کے جعدِ معنبر میں نقرئی موباف
کسی کا چہرۂ پُرنور مثلِ آئینہ صاف
کروں میں محرم و کرتی کے اُن کی کیا اوصاف
قلم کی طرح سے ہوتا ہے غم سے سینہ شگاف
نصیب اُن کو شب و روز اب ہے سینہ زنی
ملے ہے کھانے کو ہیرے کی بھی نہ اُن کو کنی

وہ لوگ بسترِ سنجاب پر جو سوتے تھے
سحر گلاب سے جو منھ کو اپنے دھوتے تھے
تمام عمر کو لہو و لعب میں کھوتے تھے
وہ بال بال میں موتی سدا پروتے تھے
اب اُن کا حال تباہی سے ایسا ابتر ہے
بچھونا خاک ہے اور خشت بالشِ سر ہے

جو گُندھے پھولوں کے پھرتے تھے پہنے گردن میں
اکڑتے پھرتے تھے مانندِ سرو گلشن میں
سراپا محوِ تماشا تھے اپنے جوبن میں
خوشی سے پھولے سماتے نہ جامۂ تن میں
ہوئے وہ اندنوں نانِ شبینہ کو محتاج

اگرچہ شیر سے تھے پر ہو گئے وہ روبہ مزاج

سحر نے اپنا گریباں کیا ہے غم سے چاک
ہے ہے نرگس بیمار بھی سدا غمناک
اڑاتی پھرتی ہے سر پر صبا چمن میں خاک
پہن کے بیٹھی ہے سوسن بھی ماتمی پوشاک

بہارِ گلشنِ دہلی پہ آ گئی ہے خزاں
رہا نہ صفحۂ ہستی پہ ان کا نام و نشاں

ہر اک مکاں تھا یہاں رشکِ قصرِ رضواں
ہر اک کوچہ میں موجود عیش کا ساماں
ہر اک جواں تھا یہاں رشکِ حور اور غلماں
ہر اک مکاں میں رہتی تھی محفلِ خوباں

بجائے بلبل و طاؤس بولتے ہیں کلاغ
ہر اک مکاں میں ہے موجود آشیانۂ زاغ

ہر ایک کمرہ تھا روشن بسانِ برجِ حمل
یہ ہوتے ہی در و دیوار ان کے پر صیقل
مثالِ کاخِ مصور سجا ہوا ممتثل
نظر وہ آتی تھی جو چیز تھی ادھر اوجھل

نہ وہ حسین رہے اور نہ وہ مکان و مکیں
سڑک کے واسطے دلی میں رہ گئی ہے زمیں

ہر اک حکیم یہاں تھا ارسطوئے ثانی
ہر اک حسین یہاں رشکِ ماہِ کنعانی
ہر اک امیر کو تھا دعویِ سلیمانی
ہر اک فقیر کو حاصل تھا علمِ عرفانی

بسانِ نقشِ قدم ہو گیا ہر اک پامال
دیارِ ہند سے سب اٹھ گئے ہیں اہلِ کمال

وہ جتنے رہتی تھیں دلی میں رنڈیاں جو حسیں
خجل تھا عارضِ روشن سے جن کے ماہِ مبیں
کوئی تھی حور شمائل کوئی تھی زہرہ جبیں
سرود و رقص سے پامال ان کے اہلِ زمیں

یہ انقلابِ فلک سے وہ ہو گئیں ناچار
جہاں میں پھرتی ہیں آوارہ مثلِ گرد و غبار

بنے ہوئے تھے وہ چوپڑ کے چوک میں بازار — کہ جیسے چار چمن ہوں بسلکِ گلزار
ہر ایک دیدۂ آئینہ روشن و ہموار — خجل تھا جس سے خطِ عارضانِ گل رخسار

ہر اک دکان میں بیٹھا ہوا ہے فریادی
ٹپک رہی در و دیوار سے ہے بربادی

اور اس میں حوض تھا اک مثلِ چشمۂ کوثر — بجائے آب وہ لبریز نور سے یکسر
ضیا میں چشمۂ خورشید سے بھی روشن تر — صفا میں چادرِ مہتاب کا تھا وہ ہمسر

سراپا بھر دیا ہے اس میں خس و خاشاک
اٹا ہوا وہ پڑا ہے مثلِ تودۂ خاک

یہ نہر دونوں طرف خوشنما تھی اس کی رواں — زمیں میں چھپ گیا خجلت سے چشمۂ حیواں
صفائے آب سے شرمندہ اس کے تھا نیساں — لبوں کو چاٹتے تھے پانی پی کے حور وشاں

ہوئی ہے فرطِ کدورت سے اب وہ خاک آلود
تمام خاک میں بس مل گئی ہے اس کی نمود

وہ موجیں اس کی لطافت میں مثلِ کاکلِ حور — حباب اس کے نمایاں بشکلِ قبۂ نور
چراغ اس کے فروزاں وہ مثلِ شعلۂ طور — بوقتِ سیر وہ تھی خاص و عام کی منظور

یہ کاوکاوِ زمانہ سے ہو گئی ہے خراب
کہ جیسے ماہی تڑپتی ہے خاک پر بے آب

یہ گرد بوقلموں اس کے کثرتِ اشجار — شگفتہ چار طرف گویا تختۂ گلزار

نثار ہوتی تھی ہر صبح اُس پہ بادِ بہار ہجومِ خلق سے رونق فزا وہ لیل و نہار
خزاں رسیدہ نظر آتا تھا ہر ایک شجر
ہر ایک برگ بنا اُس کا صورتِ محشر

سُناتے پھرتے تھے سقے کٹوروں کی جھنکار وہ گل فروشوں کے پھولوں کے ٹوکروں کی بہار
وہ سودا بیچتے تھے لوگ واں پکار پکار وہ پھرنا خوانچہ والوں کا واں قطار قطار
رکھا تھا دہلی کا لوگوں نے نام عشق آباد
بسانِ خانۂ عاشق وہ ہو گئی برباد

جو نافِ شہر میں واقع تھی مسجدِ جامع وہ حسن و وسعت و رفعت میں گویا تھی جامع
بسانِ برجِ حمل اُس کے برج تھے لامع موذنوں کے فرشتے وہاں کے تھے سامع
کیوں کہ ہووے جہاں میں وہ واجب التعظیم
بنی ہوئی ہے سراسر وہ شکلِ عرشِ عظیم

تھے اُس کے چار سو چوپڑ کے خوشنما بازار خجل تھا جن سے خطِ عارضانِ گل رخسار
برنگِ بزم وہ آراستہ تھے لیل و نہار سہ پہر کو تھی وہ گدڑی کی سیڑھیوں پہ بہار
فلک نے کر دیا ہر سمت اُس کے ویرانہ
بنا ہے ایک طرف اُس کے اب شفا خانہ

نمازی دیکھ کے ہر صبح اُس کو روتے ہیں مدام چہروں کو اشکوں سے اپنے دھوتے ہیں
اسی کے رنج و تاسف میں جان کھوتے ہیں نہ دن کو کھاتے ہیں نہ رات کو وہ سوتے ہیں
وہابی ہو گئے ہیں سارے اندنوں باہم
کسی کو رکھنے نہیں دیتے اُس جگہ پہ قدم

یہ شہر وہ ہے کہ تھے اس میں خلد کے ساماں
ہر ایک طفل یہاں کا تھا ثانیِ غلماں
ہر ایک شخص یہاں تھا بجائے خود رضواں
دبیرِ چرخ کا ہمسر تھا یاں ہر ایک جواں

رہا نہ کوئی جواں اور نہ کوئی پیر امیر
برائے مخبری کے رہ گئے ہیں چند شریر

اکڑ کے پھرنا جوانوں کا وہ سر بازار
کسی کے ہاتھ میں باندی کوئی لیئے تلوار
پہنکے ٹوپیاں زریں وہ باندھ کر دستار
کوئی تھا گھوڑا کودا تا کوئی تھا فیل سوار

نہ وہ جوان رہے اور نہ کوئی ہے خوشحال
رہے ہیں شہر میں اب کھانے والے ماش کی دال

مدام جنتی لوگوں کو رہتی ہے عسرت
عبث ہے منعموں کو نازِ سطوت و شوکت
کہ اُن کے واسطے حق نے بنائی ہے جنت
مثال سانپ کے پلٹے گی اُن کو یہ دولت

جو اہلِ دین ہیں اُن کے لیئے ہے باغِ نسیم
جو مشرکین ہیں اُن کو ملے گی نارِ جحیم

میں دردِ دل کہوں اب کس سے جا کے اے محسنؔ
شبانہ روز ہوں میں مبتلائے رنج و محن
نہ کوئی یار رہا ہے نہ کوئی اہلِ وطن
مٹا ہے سامنے آنکھوں کے میری یہ گلشن

خدا کرے کہ یہ ہو جائے پھر چمن آباد
مثالِ گل کے ہوں باشندے یاں کے خرم و شاد

ایضاً

وہ پری چہرہ ہوئے قتل میانِ دہلی
ایسی آباد تھی کیا کیجے بیانِ دہلی
موت بھی جن کی ہوئی آفتِ جانِ دہلی
ہو گی جنت بھی نہ آباد بسانِ دہلی

بے نشاں ہو گیا عالم میں نشانِ دہلی — لامکاں بن گیا ایک ایک مکانِ دہلی
ملتا دیکھا جو بہت نقشہ یہاں کا ہم نے — ہو گیا روضۂ رضواں پہ گمانِ دہلی
نامِ خورشید ہے محشر میں دکھانے کو فلک — رکھتا ہے سینہ پہ یہ داغِ زبانِ دہلی
کیا کہیں ملکِ عدم میں یہیں سے جاکر — ہوئے جاتے ہیں جو معدوم مکانِ دہلی
پیرہن شکلِ زلیخا ہے یہ کنعاں ہیں جواں — خالی از حسن نہیں پیر و جوانِ دہلی
ابر سمجھو نہ اسے چھا گیا ہے گردوں پر — دودِ آہِ جگرِ سوختگانِ دہلی
غم و غصہ تو سدا کھاتے ہیں عشرت کے سبب — پیتے ہیں خونِ جگر بادہ کشانِ دہلی
ہوئیں بے خواب جو چشمانِ ملایک شاید — تا فلک پہونچ گیا شور و فغانِ دہلی
لوگ جب دہلی کو دیں خلد بریں سے نسبت — کہیں ہر پیر کو ہم کیوں نہ جوانِ دہلی
ہے کہاں کوچہ و بازار و محلہ باقی — خط پہ کیا خاک لکھوں نام و نشانِ دہلی
ادب آموزِ ملایک ہیں یہاں کے جاہل — رشکِ حورانِ بہشتی ہیں بتانِ دہلی
چشمۂ آبِ بقا نام تھا جس کا اب وہ — اشکِ حسرت سے بھری نہرِ روانِ دہلی
گھر لٹا مال لٹا جان گئی اب تک بھی — ہیں مصیبت میں مصیبت زدگانِ دہلی
وا رہیں آنکھیں پس از قتل بھی مقتولوں کی — تن بیجاں ہیں مگر ہیں نگرانِ دہلی
اب جو دلی ہوئی آباد تو کیا خاک ہوئی — جن سے زینت تھی کہاں ہیں وہ جوانِ دہلی
بسے سرسبز تھے عالم میں فرشتے آکر — لا کے دکھلاتے تھے رضواں کو مکانِ دہلی

کیوں نہ مطبوع جہاں یاں کی زباں ہو محسنؔ
سب زبانوں کی خلاصہ ہے زبانِ دہلی

مہدی - سید مہدی حسین مرحوم دہلوی

رات دن لب پہ نہ ہو کیونکہ بیانِ دہلی
نہ مکیں اب وہ رہے ہے اور نہ مکانِ دہلی

بعض مقتول ہوئے بعضوں نے پھانسی پائی
نام کو بھی نہ رہے ہے پیر و جوانِ دہلی

شکوہ بے فائدہ کرتا ہے کسی کا ہمدم
تھا مقدر میں لکھا یونہیں زیانِ دہلی

نہیں بازارِ محبت میں خریدارِ دل
چھان ڈالی ہے ہر ایک میں نے دکانِ دہلی

نہ وہ اربابِ طرب ہیں نہ وہ ہیں اہلِ نشاط
ہاں نظر آتے ہیں کچھ مرثیہ خوانِ دہلی

غمزہ تھا آفتِ جاں اور قیامت قامت
عجب انداز کے تھے ماہ رخانِ دہلی

گھس کے صندل کا لگانا جنھیں تھا دردِ سر
دل پہ رکھتے ہیں وہ اندوہِ گرانِ دہلی

فرشِ گل پر جو جھجکتے تھے قدم رکھتے ہوئے
چلتے کانٹوں پہ ہیں وہ نازکنانِ دہلی

عرش پہ غش آئے اگر دیکھتے حضرت یوسف
ایسے انداز کے تھے کج کلہانِ دہلی

جھک گیا چرخ خجل ہو کے قدمبوسی کو
اس نے دیکھی تھی کبھی رفعتِ شانِ دہلی

ہوش جاتے رہے تھرا گئی نارِ دوزخ
پہونچی افلاک پہ جب آہ و فغانِ دہلی

خاک جل بھن کے تو ہو جائے گا چرخِ بدکیش
نالہ کرنے بیٹھے جو دلسوختگانِ دہلی

کچھ عجب نقشہ یہاں کا نظر آتا ہے مجھے
کیونکہ دلی پہ کیا جائے گمانِ دہلی

اور شہروں کو کریں لاکھ تکلف لیکن
نہیں ہونے کی میسر یہ زبانِ دہلی

ہیں نئے رنگ نئے روپ جہاں کے مہدی
کفِ افسوس ہیں اور لالہ رخانِ دہلی

ہنرؔ۔ میرزا الٰہی مرحوم۔ دہلوی

تھے ہنرؔ ہم سببِ عظمت و شانِ دہلی
نہ رہے ہم نہ رہا نام و نشانِ دہلی

اس کو لازم ہی بیابانِ عدم سے تشبیہ
نہیں اس شہر پہ اب ہم کو گمانِ دہلی

واہ کیا گرمیِ گفتار ہی سبحان اللہ
شعلہ و برق و شرارہ ہی زبانِ دہلی

خلد سے آتے ملائک تھے خریداری کو
ایسی آباد تھی ہر ایک دُکانِ دہلی

رفعتِ عرشِ معلے سے بھی سبقت لے جائے
لکھنے بیٹھوں ہیں اگر رفعت و شانِ دہلی

آہ ای پیرِ فلک دیکھ تری گردش سے
کس طرح قتل ہوئے پیر و جوانِ دہلی

نام مٹنے کا نہیں حشر تلک ہوے گا
گو فلک تو نے مٹایا ہی نشانِ دہلی

ساکنِ باغِ جناں رہتے تھے مشتاق اس کے
قصرِ جنت سے بھی بہتر تھے مکانِ دہلی

عدم آباد ہی برباد ہوئے سے یہ دیار
اب وہ مُردے ہیں جو بستے تھے میانِ دہلی

حوریں جنت کی جنھیں دیکھ کے پڑھتی تھیں درود
وہ حسیں حق نے بنائے تھے میانِ دہلی

ٹوٹ جاتا ہی دل انسان کا دہلی کی طرح
جب ہنرؔ ہم کبھی کرتے ہیں بیانِ دہلی

سوداؔ۔ ملک الشعرا مرزا محمد رفیع مرحوم دہلوی

مرزا محمد شفیع دہلوی کے صاحبزادے اور شاہ حاتمؔ کے شاگرد تھے ۱۱۲۵ھ ۱۷۱۲ء میں ولادت ہوئی، شاہ عالم کی بارگاہ سے ملک الشعرا کا خطاب ملا۔ لکھنؤ پہونچکر نواب آصف الدولہ کے دربار سے چھ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر عطا ہوئی۔ نادر شاہ کا حملہ جو ۱۷۳۹ء میں ہوا اس سے قبل کی بدنظمی

اور بعد کے انقلاب سے متاثر ہو کر سودا نے جو نظم لکھی تھی وہ اس مجموعہ میں انقلابات دہلی سے متعلق ہونے کی بنا پر شامل کر دی ہے۔ سودا مرحوم کا انتقال بعمر ستر سال ۱۱۹۵ھ م ۱۷۸۱ء لکھنؤ میں ہوا وہیں دفن ہوئے۔ مطبوعہ کلیات ان سے یادگار رہے۔ ان کا مشہور شہر آشوب یہ ہے۔

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں ہے ڈانواڈول ۔۔۔ پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو لیکے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے کہ اس کے جواب میں دو بول ۔۔۔ اگر کہوں میں تو سمجھے گا تو کہ یہ ہے ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیر یوں یا تول

سپاہی رکھتے ہیں نوکر امیر دولت مند ۔۔۔ سو آمد اُن کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند ۔۔۔ جو ایک شخص تھا بائیس صوبہ کا خاوند
رہی نہ اُس کے تصرف میں فوجداری کول

قوی ہیں ملک میں مفسد امیر ہیں سو ضعیف ۔۔۔ ٹکے کہاں جو ہیں وے بکے ہوں انھوں سے حریف
جو عامل اب ہیں محالات کے سو یوں ہی خفیف ۔۔۔ نہ کچھ ربیع میں حاصل نہ کچھ میان خریف
کہ جس طرح کسی حاکم کے گھر گنوار ہو اوّل

بس ان کا ملک میں کار نسق جو یوں ہو تباہ ۔۔۔ کہ کوہ زر ہو زراعت میں تو نہیں پر کاہ
جگہ وہ کونسی نوکر رکھیں یہ جس پہ سپاہ ۔۔۔ کہاں سے آویں پیادے کریں جو پیش نگاہ
کدھر سوار جو پیچھے چلیں وہ باندھ کے غول

رہی فقط عربی باجہ پر اُنھوں کی شان ۔۔۔ جو چاہیں اس کو نہ بجوائیں وہ تو کیا امکان
پر اُن کو فکر ہے تخفیف خرچ کا ہر آن ۔۔۔ رہے گا حال اگر ملک کا یہی تو ندان
گلے میں تاشہ کہاروں کے پالکی میں ڈھول

انہیں ہے اپنی امارت سے اب یہی منظور ۔۔۔ کہ ہوں دو مورچھل اور ایک کا بنے طنبور

۱ ضمانت میں دیا ہوا آدمی

نہ رسم صلح کی سمجھیں نہ جنگ کے دستور   جو اُن میں قاعدہ واں رہتے ہوئے وہ ایسے دور
تماشش ان کی طبیعت کا ہر طرح سے ٹٹول

امیر اب جو ہیں دانا انھوں کی ہے یہ چال   ہوئے ہیں خانہ نشیں دیکھ کر زمانہ کا حال
بچھی ہے سوزنی خوجا کھڑا ابھلے ہے رومال   حضور بیٹھے ہیں[۲] دو اک ندیم اہلِ کمال
دھری ہے رو برو ایک پیکدان اک تنبول

جو کوئی ملنے کو اُن کے انھوں کے گھر آیا   ملے یہ اُس سے گر اپنا دماغ خوش پایا
جو ذکرِ سلطنت اس میں وہ درمیاں لایا   اُنھوں نے پھیر کے ادھر سے منہ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول

جو مصلحت کے لیئے جمع ہوں صغیر و کبیر   تو ملک و مال کا فکر اس طرح کریں ہیں مشیر
وطن پہونچنے کی سوجھی ہے بخشی کو تدبیر   کھڑا یہ اٹکلے دیوانِ خاص بیچ وزیر
کہ شامیانوں کے بانسوں پہ نقرئی ہیں خول

تجمل ہو یہ نہ سمائے زمیں بہت بھائی   گئے وہ مشورہ میں کھیلیں جو سوا[۱] ٹاپائی
تمام عمر ہی تدبیر ملک میں کاٹی   نذان کر اُٹھے مل کر گھر اینٹ کا ماٹی
پھر اپنے زعم میں ہر اک برائے خود بہلول

پڑے جو کام اُنھیں تب نکلے کھائی سے   رکھیں وہ فوج جو موٹی پھرے لڑائی سے
پیادے وہ جو ڈریں سر منڈاتے نائی سے   سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا اُنھوں کے نیچے الول[۳]

نہ صرفِ خاص میں آمد نہ خالصہ جاری   سپاہی تا متصدی سبھوں کو بیکاری
اب آگے دفترِ تن کی میں کیا کہوں خواری   سوالِ دستخطی کو پھاڑ کرکے پنساری

۱ انانہ کرے ۳ اکیل ۲ چھدنا کودنا۔

کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کنٹول

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار — تلاش کر کے ڈھٹیلی اُنھوں نے کی ناچار
ندان بنیوں کے دی قرض میں سپر تلوار — گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لیکے وہ ہتھیار
بغل کے بیچ تو سوٹا ہے ہاتھ میں کچکول

کروں معاش کا حضرت کی تجھ سے کیا میں بیان — کہ توشہ خانہ ہے اُن کا پرانچہ کی دُکان
نکل تنور کے مُنہ سے کہے ہے گاوزبان — بکی ہوں تب ہیں کہ جب تھے کاتبیِ خلد مکان
بکے ہے تیسرے فاقے میں کوڑیوں کے مول

کہو جو مودی سے جا کہدو آپ کے حالات — جواب دے وہ کہ ہیں آپ تو فرشتہ کی ذات
ہوا پہ جیتی ہے پیلوں کی اور بس پہ برات — جو خچریں ہیں اُنھوں نے پیا ہے آبِ حیات
تمھارے کھانے کو دانہ کہو تو دیجے تول

جو اصطبل میں کئی گھوڑے ہیں تو کیا امکان — کہ ہووے گھانس کے پتے کا اُن کے آگے نشان
کسی کی ٹوٹی ہے ٹنگری کسو کا جھڑ گیا کان — طویلہ اُس کو کہوں یا کہ پنج پیر کا تھان
اسی خیال میں رہتی ہے عقل ڈانواں ڈول

اور اب جو زعم میں آقا کے فیل خانہ ہے — جو ہتنی اندھی ہے اُس میں تو ہاتھی کانا ہے
نہ ٹھور چارے کا راتب کا نے ٹھکانا ہے — ہر ایک بھوک سے سوئے عدم روانا ہے
اب اُس کو خواہ وہ پائل سمجھ لیں خواہ جھول

کریں ہیں بھوک سے شاگرد پیشہ اب یہ معاش — کہیں پلاؤ تو باورچی دال پکا دیں آش
کریں قناتوں میں دربان بیٹھے پردہ فاش — تلے سے اُن کے مسند کو کھینچ لیں فرّاش
اگر کہیں کہ منا اُٹھ کے چاندنی کا جھول

۱ ہتھیار بند محافظ کا عہدہ ۲ پرانے کپڑے بیچنے والا ۳ نیشا پور کا مشہور شاعر اور خوشنویس
۴

یہ خادمانِ محل کی ہے اندنوں صورت
نہ خوان دھونے کا کشمیرنی میں باقی ست
نہ اُٹھ کے ہلنے کی ہرگز نہ رینے کی طاقت
بنی ہے بھوک سے درباریوں کے منہ کی گت
کہ بوڑھی ہتنی کے جس طرح بیٹھ جائیں کپول

پچار کھی ہے سلاطینوں نے یہ تو بہ دھاڑ
کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریباں پھاڑ
کوئی در اپنے پہ آوے دے مارتا ہے کواڑ
کوئی کہے جو ہم ایسے ہی چھاتی کے ہیں پہاڑ
تو چاہیے کہ ہمیں سب کو زہر دیجے گھول

غرض مآل ہے اس گفتگو سے یہ میرا
کہ بے زری نے گھر ایسا جب آنکر گھیرا
تو کوئی قصد کرے نوکری کا بہتیرا
نہیں ہے فائدہ کچھ تا وہ چھوڑ کر ڈیرا
کرے نہ عزم سوئے اصفہان و استنبول

جو نوکری ہے کہیں زیرِ چرخ نیلی فام
سو جائداد کا اُس کی ہے پرگنہ نیلام
وبا کا جیسے ہے دارالخلافہ میں ہنگام
گھروں کی ضبطی کا حکم اس قدر ہوا ہے عام
ادھر کسی کا دکھا سر اُدھر سے دوڑی قول[۱]

سو کیا وہ نوکری نکٹی ہو جس میں یہ اوقات
ملے ہے پیٹ کو روٹی سو روروا دھی رات
جو چاہیں تن ڈھپے اس میں سو آگے پیچھے پات
اور اُس پہ یہ ہے کہ ہر روز بھرے موجودات
جو پانچوں باندھیے ہتھیار اور چھٹی پستول

وہ نوکر اب جسے آقا ہر آن پہچانے
جو پوچھو اُس سے کہ تم کچھ روپے لگے پانے
کہے ہے آہ وہ بھر کر سوائے آٹھ آنے
روپیہ کی شکل تو دیکھی نہیں خدا جانے
کہ اس زمانہ میں چپٹا بنے ہے وہ یا گول

غرضکہ جب کہیں ملتا ہو پاؤ بھر بھی چون
کرے وہ نوکری جس کو کہ ہووے خبط وجنون

۱ سپاہیوں کی بھیڑ

یہ سمجھو کہ نہیں جب سپہ گری کے فنون
نئے تو سیکھ کے یوں باندھنے لگے مضمون
زمانہ دیکھ کے ہتھیار ہم نے ڈالے کھول

سخن جو شہر کے ویرانے سے کروں آغاز
تو اس کو سن کے کریں ہوش چند کے پرواز
نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز
کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہر نماز
تو واں چراغ نہیں ہے بجز چراغ غول

کسی کے یاں نہ رہا آسیا سے تابہ اجاغ
ہزار گھر میں کہیں ایک گھر جلے ہے چراغ
سو کیا چراغ وہ گھر ہی گھروں کے غم سے داغ
اور ان مکانوں میں ہر سمت رینگتے ہیں الاغ
جہاں بہار میں سنتے تھے بیٹھ کر ہنڈول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جس کے دیکھے سے جاتی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اداس
بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم
نجانے کس نے رکھا یہاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو و صنوبر وہاں اگے ہے زقوم
مچی ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھیں کلول

رہیں تھے سیر یہ پنگھٹ کے گرد کے دیہات
کہ لب جہاں کی تھے پنہاریوں کے آب حیات
اور ان درختوں کی وہ چھائیں اور گھنے سے پات
نہ وہ درخت ہیں اب واں نہ آدمی کی ذات
کوئیں میں مردے پڑے ہیں نہ رسمان ہے نہ ڈول

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا
مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں اٹھا دیا گویا کہ نقش باطل تھا
عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا

که جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

دیا بھی واں نہیں روشن تھے جس جگہ فانوس   پڑے ہیں کھنڈروں میں آئینہ خانہ کے مانوس
کروڑ دل پُر از اُمید ہوگئے مایوس   گھروں سے یوں نجبا کے نکل گئے ناموس

ملی نہ ڈولی اُنھیں جو تھے صاحبِ چڑ دول

نجیب زادیوں کا اندنوں ہی یہ معمول   وہ برقع سر پہ ہی جس کا قدم تلک ہے طول
ہی ایک گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول   اور اُن کے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ اصول

که خاک پاک کی تسبیح ہی جو لیجئے مول

اگر محب ہوا وہ مستمع تو سُن یہ نام   دیا کچھ اُس نے بمقدور کرکے نذرِ امام
پڑا جو شامت طالع سے خارجی سے کام   دروغ و راست کا لایا وہ درمیان کلام

یہ آگئے اور چلیں کہہ کے زیر لب لاحول

غرض میں کیا کہوں یارو کہ دیکھ کر یہ قہر   کروڑ مرتبہ خاطر میں گذرے ہی یہ لہر
جو ٹک بھی امن دل اپنے کو دیوے گردشِ دہر   تو بیٹھ کر کہیں یہ روئیے کہ مردمِ شہر

گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول

بس اب خموش ہو سودا کہ آگے تاب نہیں   وہ دل نہیں ہی کہ اس غم سے جو کباب نہیں
کسی کی چشم نہ ہوگی کہ وہ پر آب نہیں   سوائے اس کے تری بات کا جواب نہیں

که یہ زمانہ ہی اک طرح کا زیادہ نہ بول

ایضاً

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہی   دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہی
میں حضرت سودا کو سنا بولتے یارو   اللہ رے اللہ رے کیا نظم بیاں ہی

اتنا میں کیا عرض کہ فرمایئے حضرت
آرام سے کٹنے کی طرح کوئی بھی یاں ہے

سنکر یہ لگے کہنے کہ خاموش ہی رہ جا
اس امر میں قاصر تو فرشتوں کی زباں ہے

کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانہ میں کئی شکل
ہے وجہِ معاش ایسی سو جس کا یہ بیاں ہے

گھوڑ لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے

گذرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر
شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیئے کے ہاں ہے

ثابت ہے جو دگلا تو نہیں موزوں میں کچھ حال
تیروں میں ہے پر گیری تو بے چلّہ کماں ہے

کہتا ہے نفر غرّہ کو صراف سے جا کر
بی بی نے تو کچھ کھایا ہے فاقہ سے میاں ہے

یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ
شوال بھی پھر ماہِ مبارک رمضاں ہے

اس رنج سے جب چڑھ گئے چھتیس مہینے
تنخواہ کا پھر بیٹنا اس شکل سے یاں ہے

لیتے ہیں بایں رو سبھی وہ تو دو ماہہ
ٹاٹ و ہونس دھڑکے کی جنھیں تاب و تواں ہے

قاضی کی جو مسجد ہے گدھا باندھکے اس میں
بیٹھا ہوا اس شکل سے ہر پیر و جواں ہے

ملا جو اذاں دیوے تو منہ موندکے ہں کا
کہتے ہیں کہ خاموش مسلمانی کہاں ہے

بولا جو خطیب اس میں تو ماری اسے اک دھول
ہاتھ آگیا واعظ تو تھپیڑا او وہاں ہے

رینکے ہے گدھا آٹھ پہر گھر میں خدا کے
نے ذکر نہ صلوٰۃ نہ سجدہ نہ اذاں ہے

اور وہ ہیں جو کمزور وہاں آن کے بیٹھیں
رہتی کے جو آگے کی وہ ہر ایک دکاں ہے

اُٹھ اُٹھ کے دکھاتے ہیں اُنھیں حال وہ اپنا
دربار رو[1] اس عہد میں جو خورد و کلاں ہے

یوں بھی نہ ملا کچھ تو ہر اک پالکی آگے
اس وجہ سے رسالہ کا رسالہ ہی رواں ہے

کوئی سر پہ کیئے خاک کوئی چاک گریباں
کوئی روئے ہے منہ پیٹ کوئی نعرہ زناں ہے

ہندو و مسلماں کو پھر اُس پالکی او پر
ارتھی کا تو ہے جنازے کا گماں ہے

[1] دربار میں جانے والا۔

یہ مسخرہ کی دیکھ کے جا صاحب[1] ارتھی
گر ہو جیے جا کر کسی عمدہ کے مصاحب
وہ جاگے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں وہ زانو
بے وقت خورش اس کے جو ہو اپنے تئیں بھوک
گھڑیال کی چپ بیٹھے ہوئے گنتے ہیں گھڑیاں
خمیازہ پہ خمیازہ ہے اور ہڑت[3] او پہ چڑت
صیغہ یہ طبابت سے بھلا آدمی نوکر
صحبت ہی یہ اس سے اگر آقا کے تئیں چھینک
دیتے ہیں منگا تیر و کماں ہاتھ میں اس کے
اور ماحضر اور پرچہ وہ نواب کو دیکھے
مطبوخ میں ہی خربزہ اور خربزہ پر دودھ
یہ بھی تو نہیں ہے کہ اسی سے ہو تسلی
اس میں جو کہیں درد اٹھا پیٹ میں اس کے
رکھتے ہیں غرض مرگ سے لڑنے کو سپاہی
سوداگری کیجے تو ہے اس میں یہ مشقت
ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجیے منزل
لے جا جو کسی عمدہ کی سرکار میں دے جنس
قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث
جب مول مشخص ہوا مرضی کے موافق

کرتے ہیں جو واں[2] عرض تو نہ نا و نہ ہاں ہے
اس کی تو اذیت بھی ہی آفتِ جاں ہے
کیسا ہی اگر اپنے تئیں خواب گراں ہے
سو کیا کہوں تجھ سے کہ مصیبت کا بیاں ہے
اور بیچ خلا و دن میں جو لاسپ دواں ہے
ہو نہ صورتِ سوفار مگر شکلِ کماں ہے
سو دو دو روپیہ کا جو کسی عمدہ کے ہاں ہے
آوے۔ تو وہ اس کو بخشونت نگراں ہے
ٹھنڈی ہوا آنے کا گر اس وقت گماں ہے
کھانا تو یہ کھاتے ہیں کہ اس کو خفقاں ہے
ہے دودھ پہ مچھلی نس او برگ گاؤزباں ہے
اس سب پہ تفنن کے لیئے بیسنی نان ہے
پھر بو علی سینا ہے تو وہ ہیچمداں ہے
گر نوکری سمجھو یہ طبابت کی کہاں ہے
دکھن میں بکے وہ جو خرید صفہاں ہے
ہر شام یہ دل وسوسۂ سود و زیاں ہے
یہ درد جو سنیئے تو عجب طرفہ بیاں ہے
سمجھے ہے فروشندہ پہ دزدی کا گماں ہے
پھر پیسوں کا جاگیر کے عامل پہ نشاں ہے

[1] پالکی سوار [2] دربار میں [3] انگڑائی

پروانہ لکھا کر گئے عامل کئی جس وقت / کہتا ہے وہ پیسا ابھی مجھ پاس کہاں ہے
اور دست پھر آئے تو کہا جنس بھی لیجا / دیوان بیوتات یہ کہتے ہیں گراں ہے
آخر کو جو دیکھو تو نہ پیسے ہیں نہ وہ جنس / ہر اک متصدی سے میاں اور تیاں ہے
ناچار ہو پھر جمع ہوئے قلعے کے آگے / جو پالکی نکلے ہے تو فریاد و فغاں ہے
دو بیل کی جاگیر جو کہیں کیجیے کھیتی / اور مینہ بھی موافق ہی پڑے پھر تو سماں ہے
ہیں خشکی و غرقی کے تفکر میں شب و روز / نے امن ہے دل کے تئیں نے جی کو اماں ہے
گر خانہ و خوانین کی سے کوئی وکالت / اس کا تو بیاں کیا کروں تجھ سے کہ عیاں ہے
ہر عمدہ کے دروازہ پہ زین پوش پہ بیٹھا / پوچھے ہے اجی مرد ہے جی نواب کہاں ہے
ہر گھر میں وہ جا ہے کہ ہر فوارہ سا چھوٹوں / ہر کوچہ میں جوں آب چکا بو[۱] وہ رواں ہے
دیوان کے بخشی کے بیوتات کے حاضر / مانند کنہیا کے جہاں دیکھو تہاں ہے
ہر بات پٹا ہی ہے صبح سے تا شام / پیپل کے پتوے کی طرح منہ میں زباں ہے
لاوے جو کچہری سے وہ داموں کا سیاہا / للچاوے موکل کو یہ کیا خوب مکاں ہے
سو ماہی ہے بیٹھی ہی ولے پانسو ہے خرچ / اور زر کے اجالے کی بھی اک دو میں کاں ہے
بتلاوے غرض پیسے اڑا کر ہوا روپوش / گھر جا کے پکارا جو کوئی لالہ کہاں ہے
جس وقت سنا یہ وہیں آواز بدل کر / آپ ہی کہا گھر میں سے کشن چند کے یہاں ہے
پھر ہو جو موکل سے کہیں راہ میں بھیٹا / اسناد کا جاگیر کی یہ اس سے بیاں ہے
عرضی[۲] پہ ہوا ہیم سیاہے پہ ہوا جسیم / پروانہ میں تم پہ ہوں تصدق مری جاں ہے
کاہے کی غرض عرضی ہے کاہے کا سیاہا / کیدھر کا وہ پروانہ وہ جاگیر کہاں ہے
انصاف جو کیجے تو نہیں اس کی بھی تقصیر / سب ماحصل ان باتوں کا اک چپہ نال ہے

۱؎ آبچک ۲؎ یعنی عرضی پر ہم لکھ گیا یعنی منظور ہو گئی اور جسیم سے سیاہا جلدی ہو گیا۔

شاعر جو سُنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
مشتاقِ ملاقات اُنھو نکا کس و ناکس
گر عید کا مسجد میں پڑھیں جاکے دوگانا
تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر
اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا
مُلّائی اگر کیجے تو مُلّا کی ہے یہ قدر
اور ما حضر اخوند کا اب کیا میں بتاؤں
دن کو تو وہ بیچارہ پڑھا یا کرے لڑکے
تسپر یہ ستم ہے کہ نہالی تلے اُس کی
بھلسگے یہ عمل کر جو وہ شیطان کا لشکر
اب کیجئے انصاف کہ جس کی ہو یہ اوقات
جس روز سے کاتب کا لکھا حال ہیں تب سے
وہ بیت ٹکے سیکڑا لکھنے کو ہے محتاج
یہ بھی میں تکلف ہی سے کہتا ہوں وگرنہ
احیا ہو جو موتی[1] کا زمانے میں نئے سر
ہدیہ ہو سوا پانچ ٹکے گزری میں آکر
دمڑی کو کتابت لکھیں دھیلے کو قبالہ
چاہے جو کوئی شیخ سے بہر فراغت
دیتا ہے دُم خر سے کوئی شملہ کو نسبت

دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
ملنا انھیں اُس سے جو فلاں ابنِ فلاں ہے
نیت قطعِ تہنیتِ خانِ زماں ہے
گر رحم میں بیگم کے سنے نطفہ خاں ہے
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے
ہوں دو روپیہ اُس کے جو کوئی ثنوی خواں ہے
آب کاسہ دال عدس جو کی دو ناں ہے
سب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے
لڑکوں کی شرارت سے سدا خار نہاں ہے
دیوالی کو لے ہاتھ تعاقب میں دواں ہے
آرام جو چاہے وہ کرے وقت کہاں ہے
ہر صفحۂ کاغذ پہ قلم اشک فشاں ہے
خوبی میں خط اب جس کا بہ از خطِ بتاں ہے
آفاق میں ان چیزوں کی اب قدر کہاں ہے
خطاط کی اتنی بھی رہی قدر کہاں ہے
یاقوت[2] پکارے جو بکاؤ یہ قراں ہے
بیٹھے ہوئے واں میر علی چوک جہاں ہے
چھٹتے ہی تو شعرا کا وہ مطعونِ زماں ہے
گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے

۱؎ خوش نویس کا نام   ۲؎ یاقوت رقم

اور اُس کو جو دیکھے کوئی وہ بہرِ معیشت
پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہر صبح کو اُٹھ کر
تحقیق ہوا عرس تو کر ڈاڑھی کو کنگھی
ڈھولک جو لگی بجنے تو واں سب کو ہوا وجد
گرتا سے پڑتا ہے قدم تو سبھی ہنس ہنس
اور ما حصل اس رنج و مشقت کا جو پوچھو
سب پیشوں کو تجکر جو کوئی ہو متوکل
اور پیٹ کے دل کو ہے خرافت کا تیقن
جب دیکھا کہ اب لڑکے لگے بھوک سے مرنے
جب راہ خدا پیسے نکالے کوئی نواب
مضمون ہے یہی رقعہ کا کچھ دیجئے اس کو
بالفرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری
ٹک دیکھ لے منصور علی خان کا احوال
آدم سے کئنے کا سُنا تو نے کچھ احوال
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام
سوا اس پہ تیقن کسی کے دل کو نہیں ہے

اس فکر و تردد ہی میں ہر ایک زماں ہے
ہے آج کدھر عُرس کی شب روز کہاں ہے
لے خیل مریداں گئے وہ بزم جہاں ہے
کوئی گووے کوئی رووے کوئی نعرہ زناں ہے
کہتے ہیں کوئی حال ہے یا رقصِ زناں ہے
ڈالا ہوا اوان دال نخود قلیہ و ناں ہے
جو رد تو یہ سمجھے ہے نکھٹو یہ میاں ہے
بیٹی کو جنوں ہونے کا بابا کے گماں ہے
ہر خان و خوانین کے ہمراہ رواں ہے
تب اُن کی سفارش میں لئے رقعہ خواں ہے
مداح اماموں کا ہے اور مرثیہ خواں ہے
یہ شکل کبھی مت سمجھیو تو راحتِ جاں ہے
چھائی یہ کڑک بجلی ہے اور شیر دہاں ہے
جمعیتِ خاطر کسی صورت سے کہاں ہے
عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے
یہ بات بھی گوئندہ ہی کا محض گماں ہے

یاں فکرِ معیشت ہے وہاں دغدغۂ حشر
آسودگی حرفیست یہاں ہے نہ وہاں ہے

ایضاً

باغِ دہلی میں جو اک روز ہوا میرا گزر — نہ وہ گل ہی نظر آیا نہ وہ گلشن نہ بہار
نخل ہیں جھڑے ہوئے اور سوکھی پڑی ہیں شاخیں — خاک اڑاتی ہیں ہر اک طرف پڑے ہیں خس و خار
مسکراتا تھا جہاں غنچہ و گل ہنستا تھا — اشکِ شبنم کے بھی قطرے کے نہیں واں آثار
جس جگہ جلوہ نما ہوتے تھے سرو و شمشاد — مشت پر قمری کے اس جا نظر آئے یک بار
دیکھتا کیا ہوں مگر سوکھی سی اک شاخ اوپر — عندلیب ایک ہے بے بال و پر و دل افگار
بدمِ سرد و بصد حسرت و صد سوزِ جگر — دیکھ کر سوئے چمن کہتی ہے با نالۂ زار

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

تمام شد

صحت نامہ اغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴	۱۷	جائے افسوس	ہائے افسوس
۵	۱	کھول حال	کہوں حال
"	۱۱	یاد خزاں	بادِ خزاں
"	۱۵	جور فلک	جورِ فلک
۶	۳	سچ تو بتا	سچ تو بتا
"	۱۲	ہوا	نہ ہوا
۱۱	۱	نہ نشان	نہ شان
۱۴	۲	نہ چھوئے	نہ چھوڑے
۲۱	۱۴	نہ مٹاٹا	نہ مٹانا
۲۴	۱۱	کانوں پہ	کانٹوں پہ
۲۵	۱۴	اٹھاس	اٹھائیں
۲۶	۱۸	کہ ہیں	چھوئیں جو
۲۸	۱۲	الگ ہی	ایک ہی
۳۴	۱	سے پہلے (ایضاً) نہیں لکھا ہے	(ایضاً) ہونا چاہیے
۳۴	۱۳	صفہان دہلی	صفہان دہلی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۰	۹	بیان دھلی	میان دہلی
"	۱۷	صغیر	صغیر مرحوم
۵۶	۵	ظہور الدین	ظہیر الدین
۶۱	۹	ازوال	زوال
۶۶	۱۰	نازمیناں	نازنیناں
۷۲	۷	عزوقار	عزو وقار
۸۱	۴	روزشب	روز وشب
۸۱	۱۳	فرشتول	فرشتوں
۸۱	۱۴	چاندنی چوکِ	چاندنی چوک
۸۵	۸	" "	کوکب مرحوم جناب تفضل حسین شاگرد غالب مرحوم دہلوی
۱۰۱	۶	عشوۂ ناز	عشوۂ وناز
۱۰۲	۱۸	دملی	دہلی
"	۷	رندیاں	رنڈیاں
۱۱۶	۵	رودن	رودوں

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائے گا۔

کتب خانہ [illegible] مجلس انتظامی [illegible]

جامعہ عثمانیہ [illegible]

۱۔ اراکین مجلس اعلیٰ پانچ کتابیں ایک ماہ کے لیے اپنے پاس رکھ سکیں گے [illegible]

مجالس شعبہ جات و صدر صاحبان [illegible] ایک ماہ کے لیے اپنے پاس رکھ سکیں گے [illegible]

۲۔ اساتذہ جامعہ [illegible] کتابیں ایک ماہ کے لیے اپنے پاس رکھ سکیں گے اور [illegible]

اراکین دارالترجمہ [illegible] کتابیں بی اے و تحقیقات [illegible] رکھ سکیں گے

۳۔ طلبائے ایم اے ایل ایل بی [illegible] اپنے پاس رکھ سکیں گے [illegible]

کے طلبہ تین کتابیں دو ہفتہ [illegible] اپنے پاس رکھ سکیں گے [illegible] ہوں تو طلبہ سے حساب

طلبہ پانچ کتابیں [illegible] لیا جائیگا [illegible]

۴۔ [illegible] مقررہ [illegible] کتابیں [illegible] جاری کی جائیگی

ایک آنہ یومیہ فی کتاب [illegible] کا لانا لازم ہے

۵۔ [illegible] کتب خانہ میں کتاب [illegible] ہو جائیں تو [illegible] ذمہ داری

۶۔ کتابیں گم یا خراب ہو جائیں تو [illegible]

عائد ہوگی۔

۷۔ کتابوں پر کسی قسم کا نشان یا حاشیہ [illegible]

[illegible] جائیگا

۸۔ قلمی نسخے اور حوالے کی کتابیں

[illegible]

۱۰۔ [illegible]